افکارِ پریشاں

مجموعۂ تقاریر

جسٹس ایم آر کیانی مرحوم



پاکستان رائیٹرز کواپریٹو سوسائٹی
۷۰۔ دی مال۔ لاہور

طبع اول	اگست ۱۹۶۵
طبع دوم	اگست ۱۹۶۶
طبع سوم	جون ۱۹۷۱
تعداد اشاعت	ایک ہزار
مطبوعہ	نفیس پرنٹرز
طباعت	آفسٹ
قیمت	
سرورق	محمد جاوید
خوشنویسی	سلطان احمد

ترتیب

افکارِ پریشاں

مجھے شرم آتی ہے مگر........



آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

"پریشانئ خاطر"

جسٹس کیانی کی تقاریر کے اقتباسات سے مرتّب

کیا ہوا دیباچہ

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگرچہ آج انکارِ پریشاں کا تیسرا جنم دن ہے مگر آپ کی اجازت سے میں اسے برسی کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اب فاتحہ پڑھنے کا وقت آگیا ہے خدا کسی کے خیالات کو تین سال سے زیادہ پریشان نہ رکھے۔ تین سال کے بعد دونوں میں سے ایک کو دفن کر دینا چاہیئے یا اُن افکار کو جو پریشان ہیں یا اُس کو جو اُن سے پریشان ہے

اگرچہ آج کی تقریر کا عنوان بھی دستورِ سابق کے مطابق افکارِ پریشاں ہے لیکن مناسب ہوگا کہ اس کا دوسرا نام یہ رکھیں: ؏

مجھے شرم آتی ہے مگر ....

مگر کے آگے کئی نقطے ہیں اس لیے کہ شرم کئی باتوں سے آسکتی ہے اگر ذرا انسان میں شرمانے کی ہمت چاہیئے۔

اے وہ لوگو! جو ایمان نہیں لاتے غور سے سنو کیونکہ میں نے یہ تقریر لکھنے میں محنت سے کام لیا ہے۔ محنت اس طرح کہ جب میرے پریشان افکار بکھرتے ہیں تو دُور دُور تک پھیل جاتے ہیں مجھے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کے رستے میں کسی وادیٔ نمل سے گزرتے ہوئے کتنی چیونٹیاں پریشان ہوگئی ہوں گی۔ یہ کہنا تو شاید بجا

نہ ہو کہ "یٰاَیُّھَا النَّمْلُ اُدْخُلُوْا مَسَاکِنَکُمْ" اے وادیٔ نمل کے رہنے والو! داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں کیونکہ افکارِ پریشاں کے سلیمان شکوہ جلوس چیونٹیوں کو روندتے چلے آ رہے ہیں۔ دراصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں ایک پریشاں خیال کو بڑی مشکل سے گرفتار کر کے لفظوں کا جامہ پہناتا ہوں، پھر کاٹ دیتا ہوں اس لیے کہ یہ کپڑے دھونے سے متعلق ہے اور کوئی دھوبن ناراض ہو جائیگی۔ پھر کچھ اور لکھ کر کاٹ دیتا ہوں کیونکہ یہ حجامت کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ کسی گنجے یا نائی کی ناراضگی کا باعث بن جائے گی۔ اس مضمون کا اصل مسودہ تصحیح و ترمیم کے نشتر سے زخمی پڑا ہے۔ چودہ زخم شدید ہیں اور ایک سو چودہ خفیف۔ اس میں نو آیات ہیں اور باقی روایات اس کے لکھنے میں دس دن لگے ہیں اور افکار ویسے کے ویسے ہی پریشان ہیں۔

ابھی تک میں اپنے افکارِ پریشاں کو جمع کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں اور انشاء اللہ اس مضمون کے آخر تک آپ کو پریشانی میں مبتلا رکھوں گا۔ آپ نے کافی آرام کے دن کاٹے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد آپ کو اس قصّے نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ کہ "گاؤ آمد و خر رفت" یا کہ سُست رَو گئی اور تیز گام آئی۔ گاڑی دراصل وہی رہی صرف انجن بدلا۔ ٹکٹ بیچنے والے بھی وہی رہے اور ٹکٹ دیکھنے والے بھی وہی۔ آپ ٹکٹ خرید کر سفر کرتے رہے گاڑی آہستہ ہو گئی یا تیز، آپ کے افکار کبھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ آپ نے افکار کو اپنے نزدیک ہی نہیں آنے دیا تاکہ بلا وجہ پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ آپ کے سر کی قسم آپ میں بہت صبر ہے مگر میں آج آپ سے بارہ سال کا بدلہ نہ لے سکوں تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ میرے افکار تو شروع ہی سے پریشاں رہے ہیں۔

کچھ اپنے بارے میں

میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں . . . .
ایک نویں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا

کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے تو ہمارے گھر میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ یہ ایم آر کیانی تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کبھی ہم محمد رمضان سمجھتے ہیں کبھی ملک رنجیت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں آپ کا اصلی نام کیا ہے؟ تاکہ آئندہ ہمارے گھر میں یہ جھگڑا نہ ہو۔ میں نے جواب دیا کہ یہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور میرا نام محمد رستم ہے۔ اور جو اس کے بعد شک کرے وہ کافر ہے نیز چونکہ اس کا احتمال ہے کہ اس کے بعد آپ کے گھر میں میرے قد و قامت پر جھگڑا اُٹھے تو واضح ہو کر میں خود تو بال سے زیادہ باریک ہوں مگر میری ہڈیاں تلوار سے زیادہ تیز ہیں جن پر دو غلی باتوں کے ٹڈے نہیں گزر سکتے۔

اس لڑکے کی یہ بات کہ محض ایم آر کیانی کچھ معنی نہیں رکھتا ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ سچی ثابت ہوئی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ (wbo is who) کے نام سے بعض پبلشرز ایک ڈائرکٹری چھاپتے ہیں جس میں بقول ان کے مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں ان کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ وزیر تو مشہور ہوتے ہی ہیں، جج بھی مشاہیر میں سے ہیں۔ اور اگر وہ تصویر کے ساتھ روپے بھی بھیج دیں تو مزید شہرت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے اپنی ہسٹری شیٹ کی تصحیح کے لیے میرے پاس انگلستان سے ایک خط آیا۔ ہسٹری شیٹ میں میرا نام ملک الرحمن کیانی درج تھا جو میرے بڑے بھائی کا نام ہے وہ بھی ایم آر کیانی ہیں۔ اُن کے دو لڑکے بھی ایم آر کیانی ہیں۔ ہسٹری شیٹ میں میری سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تھا اور یہ بھی کہ فلاں سال میں میں صوبہ سرحد میں وزیر صحت ہوا جس سے صحت کچھ اچھی ہو گئی۔ مگر ۵۰ء میں وزیر بہ اصلاحات ہوا اور پھر سارے وسیلے ٹوٹ گئے۔ اور ۵۸ء میں سیاست سے بیزار ہو کر میں چیف جسٹس ہو گیا۔ القصہ سوائے آخری گناہ کے باقی سارے سیاسی گناہ میرے بھائی کے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ میرا ایڈریس سپریم کورٹ آف پاکستان لکھا تھا جہاں میرے سائے کا بھی سانس

پھولنے لگتا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ اے رہ لوگ! جو اپنے اچھے بھلے نام کو چھوڑ کر قرآن مجید کی طرح الف لام میم استعمال کرتے ہو عبرت حاصل کرو ورنہ کسی دن بغیر تنخواہ کے چیف جسٹس یا وزیر بن جاؤ گے۔

دوسرا قصہ زیادہ نازک ہے یعنی میرا نام رستم کیوں رکھا گیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے بھی ایک زنگی کا نام کافور رہ چکا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی نے ایک دفعہ اپنے مہانوں سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ میرے شوہر ان کا ہمیشہ ذکر کرتے تھے۔ مدت کے بعد جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تو اپنے شوہر سے پوچھا کیا یہی ہیں آپ کے رستم، جس سے میں نے قیاس کر لیا کہ اُن کے شوہر نے ضرور کوئی دوستی کی بات کی ہوگی۔

• بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام جلندھر خاں تھا (آپ کے فائدہ کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام ملتان خاں تھا) جب پانچ چھ سالی کی عمر تھی تو عید کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لیے بوٹ منگوائے لیکن ہمیں تسمے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارش والد سے کہا کہ بچوں کو تسمے باندھنے سکھا دیجیے۔ انھوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں تمھارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اُس کو سلام کرو گے۔ بڑے بھائی نے کہا "ہاں" اور والد مرحوم نے اُن کے تسمے باندھ دیئے۔ میری باری آئی تو میں چپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا میرے بھائی نے کان میں کہا کہ کہہ دو نا اُس میں کیا ہے ؟ تمھارے سلام سے سچ مچ سوتیلی ماں تو نہیں آجائے گی میں نے کہا کہ اگر آ گئی تو ! تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا کہ سلام تو میں نہیں کروں گا میرے تسمے کھلے ہی رہ گئے ...... اور میں غصے سے باہر نکل آیا۔ اور رونے لگا اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد مرحوم اُن دنوں شاہنامہ پڑھتے تھے اور سے من دگرز و میدان و افراسیاب" والا مصرعہ اُن کو پسند

تھا میرے نکلنے کے بعد کھلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے کہ یہ بھی بڑا رستم بنا پھرتا ہے اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت تک نہیں دیتا۔ اُس دن سے جلندھر خاں کی بجائے میں رستم خاں ہو گیا اور جب ذرا مہذب ہوا تو نام کے ساتھ محمد لگایا اور خان کاٹ دیا۔ مگر

"میرے بوٹوں کے تسمے ابھی تک کھُلے ہیں۔"

پشاور سے میرا تعلق صرف چار سال رہا ہے اور وہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ میں نے زندگی کی چار بہاریں یہاں گزاری ہیں اور اس شہر کے جن گلستانوں میں یہ گزریں وہ ایڈورڈز کالج، شاہی باغ اور وزیر باغ تھے۔ ایک دن ہم کالج سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے پاس سے گزر ہوا کچھ سفید ریل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے کہا۔ کہ یہ چیف کمشنر کی مخصوص ٹرین ہے۔ چاچا یونس بولے رستم تب مانوں گا جب اس ٹرین کے عہدے تک پہنچو۔ وہاں تک تو میں نہ پہنچ سکا لیکن اگر آپ کے دلوں تک پہنچ گیا ہوں تو پھر سفید ٹرین کی کیا حیثیت ہے۔

پہلے سال کے طالب علموں نے ایک دفعہ سارے کالج میں اسٹرائیک کرا دی تھی۔ اُن دنوں لڑکے اِس وجہ سے ہڑتال نہیں کرتے تھے کہ امتحان سخت ہیں یا سرکار کی پالیسی نرم ہے۔ بلکہ اُن دنوں ہم سیاسی آزادی مانگ رہے تھے۔ ہماری ساری عمر آزادی مانگتے مانگتے گزر گئی اور شاید یہی حسرت لے کر ہم مر جائیں گے۔ . .

. . . . میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا میں تو کہنے کو تھا کہ ایک دفعہ پیر بخش خاں کی جماعت نے کسی سیاسی تحریک میں سارے کالج کو بند کروا دیا تھا اور پھر لڑکوں کا جلوس نکالا تھا مجھے پہلے ہی احساس تھا کہ کچھ معرکہ ہونے والا ہے اِس لیے چھٹی کی درخواست بھیج دی کہ میں "سقیم" ہوں یعنی بیمار ہوں اور یہ سقیم کا لفظ حضرت ابراہیمؑ سے سیکھا تھا چنانچہ کتابیں لے کر وزیر باغ چلا گیا کیونکہ بیماری عافیت طلبی کی تھی۔ مجھے خوشی اِس بات

کی ہے کہ کم از کم پڑھے لکھے طبقے میں ایسے بھی سوچنے سمجھنے والے لوگ ہیں جو نازک موقعوں پر کتابیں لے کر وزیر باغ نہیں چلے جاتے کیونکہ جب وہ سوچتے ہیں تو ملک کی ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں۔

• اگر آپ نے "انوار سہیلی" پڑھی ہو تو آپ کی مشکل حل ہو جائے گی کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جب راجہ نے وزیر سے پوچھا کہ اگر انجان ایک اہل زراعت پر سوال کرے اور اہل زراعت کو خود بھی جواب کا پتہ نہ ہو تو کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا "کہ دشنیدہ حکایت گاما" کیا تم نے گاما کا قصہ نہیں سنا۔ گاما ایک دور افتادہ گاؤں کے جاہل لوگوں میں ایک ہی سیانا تھا۔ جب کبھی اُن کو کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو کہتے چلو گاما سے پوچھ آئیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی گاما تھا یعنی حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے اکثر خاموش رہتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے خود کم علم ہوتا تھا خصوصاً پریس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیسے جاتے "اچھا فرمایئے کہ فلانی صاحب یہ فلاں اخبار بہت تنگ کر رہا ہے اس کا کیا تدارک کریں؟ میں کہتا۔ "ضمانت ضبط کر لیجئے"۔ وہ پوچھتے کہ اگر اُس نے ہائیکورٹ میں درخواست دے دی تو پھر؟ میں کہتا درخواست تو منظور ہو گی۔ وہ پوچھتے پھر کیا کریں؟ میں کہتا کہ پھر ضمانت ضبط نہ کیجئے۔ دیکھا کیسی اچھی رائے دی۔ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں پہنچ گئی جیسے گھوڑا بھاگ دوڑ کے تھان پر واپس آ جاتا ہے۔

میری قسمت میں یا تو گندے انڈے ہیں یا گندی نالیاں۔ ان گندی نالیوں میں اگر کسی کا ایک پیسہ بھی گم ہو جاتا ہے تو وہ اُس کے لیے بچپن سے لے کر ساٹھ برس تک روتا ہے اور اُس کو روتا دیکھ کر ہم ہنستے ہیں۔ جب وہ ایک پیسے سے کچھ

زیادہ قیمت والی چیزوں مثلاً بنیادی حقوق کے لیے محض رونے کی شکل بنا تا ہے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر حقوق واقعی بنیادی ہیں اور ان کو کھو دینے میں کسی کو تامل نہیں ہے تو کیا ہم اپنی بنیادیں نہیں کھو رہے۔

حسرات ــــ زیادہ سے زیادہ غلطی یہی ہو سکتی ہے کہ حسرات کو حسرات پڑھا جائے یعنی حسرتوں کی جمع اور حسرتیں بھی میری جو جگہ جگہ بکھری ہوتی ہیں۔ کہیں اُن غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں، مرجھاتے کیا ہیں جنھیں کھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

اپنی تحریروں کے بارے میں "خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ" خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان کرنا سکھایا تو آپ اگر اپنا اور دل بیان نہ کر سکیں تو گویا اپنی پیدائش کا منشا پورا نہیں کرتے۔

میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ میں قوم کی اصلاح کے لیے کوئی مشن لے کر آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات میں نے کسی خاص ارادے سے نہیں کہی تقریر لکھتے وقت کوئی خاص مقصد میرے پیش نظر نہیں ہوا کرتا تھا لیکن لکھتے لکھتے کوئی مقصد خود بخود کھنچ آتا تھا۔ اور کیونکہ ایک طرف مجھے اپنے خلوص پر اور دوسری جانب آپ کے خلوص پر اعتماد تھا میں نے بلا تامل اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اس بات کا میں نے اُس وقت بھی اعتراف کیا اور اب بھی کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے تو اس چیز کو جسے آپ مشتعل کہتے ہیں آسانی سے بجھا سکتے تھے۔

میں نے اکتوبر ۵۸ء کے ڈیڑھ ماہ کے اندر حکومت کو صلاح دی کہ اُن کے ٹھیک مقاصد کے پیش نظر اُن کے لیے ایسا طرز عمل مناسب نہیں جس سے لوگوں کے دل اپنے پریشان خیالی کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جائیں۔ دوسری طرف آپ لوگوں کو میں چھوٹے چھوٹے قصے سناتا، ہنستا اور ہنساتا رہا تاکہ حکومت کے عاملین کے ہاتھوں کہیں زیادتی بھی ہو جائے تو آپ کے دل نہ بیٹھ جائیں۔ آپ اسے ایک عارضی

بے آرامی سمجھ لیں اور آپ کے ذہن پچھلی غلامی سے بھی بڑھ کر غلامی میں پرورش نہ پائیں۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ ذہنِ بشری پر اگر زیادہ دباؤ پڑے تو وہ پست خیالی میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور ایک قوم اِس طرح نہیں بنتی کہ اُس میں دس پندرہ آدمی تو بلند خیال ہوں اور باقی ملک میں کہیں بلند خیالی پیدا ہو تو اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

ایک دفعہ ایک بہادر افسر لڑائی میں مارا گیا جب اُس کی لاش گھر پہنچی تو اُس کی بیوی بجائے رونے کے لاش کی طرف گھُورتی رہی۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ اگر اِس کی یہ حالت رہی تو جلد ہی مر جائے گی۔ کیونکہ غم میں رونا ایک فطری امر ہے ورنہ رونے سے دل و دماغ پر دباؤ پڑتا ہے، ایک کہن رسیدہ عورت نے جب یہ دیکھا تو اُس کے شیر خوار بچّے کو اُس کی گود میں ڈال دیا۔ بچّے کو دیکھ کر وہ پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی: "میرے لال! اب مَیں تیرے لیے جیوں گی" مَیں نے تو یہی کیا کہ لوگوں کی گود میں امید کا بچہ ڈال دیا اور رُلانے سے مراد یہ تھی کہ ایک تو غم ان کو نہ کھا جائے اور دوسرے اپنے ماضی کی بدعنوانیوں پر روئیں۔ محرم میں نیک لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو خود روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے تو وہ داخلِ جنت ہو جاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اِن تینوں باتوں میں سے مَیں کونسی صورت کا ذمہ دار تھا۔ اور دُوسرے لوگ کون سی بات کے۔ مگر تینوں صورتیں ثواب کی تھیں اور کم از کم آپ کے دل کی جنّت میں تو داخل ہو گیا۔ میرے قرآنی باپ نے جنت دانۂ گندم کے بدلے بیچ ڈالی، میرے روحانی باپ نے ایک سیاہ خال کے بدلے سمرقند و بخارا بخش دیئے۔ میں اگر پانچ سال رونے میں بھی بسر کروں تو کم ہیں، ویسے مَیں رویا نہیں کرتا نہ مجھے ہنسی زیادہ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں سے زیادہ منافقوں سے کہا ہے کہ تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کریں گے۔ مَیں کہتا ہوں کہ تم بھی ہنسو اور ہم بھی ہنسیں گے۔ بس میرا رول اُن دنوں میں یہی تھا کہ آپ کا دِل بہلاؤں۔

جس زمانے میں مَیں سیشن جج تھا۔ ایک دفعہ ایک بڑے عہدے سے جو میرے لائق نہیں تھا یا شاید جس کے مَیں لائق نہیں تھا مجھے محروم رکھا گیا۔ والد مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی تکلیف آتی تو کہتے کہ اسی میں خیر ہو گی۔ اِس مرتبہ بھی انھوں نے کہا کہ اس میں خیر ہو گی۔ اب تم سیشن جج کی حیثیت سے ہر مہینے میں دس بارہ دن کوہاٹ میں آ کر کام کرتے ہو، ہمارے پاس رہتے ہو ہمیں بڑھاپے میں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اگر تمھیں ترقی ملتی تو پھر ہم سے ملنے کم آیا کرتے۔ مَیں نے مایوسی کے عالم میں توازن کھو کر کہا آپ ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی چھوٹے بچوں کو بہلاتا ہے۔ والد مرحوم نے نرم مسکراہٹ سے، جس کی یاد سے میری غیر مستحکم اور مضطرب انسانیت اپنی جگہ پر واپس آ جاتی ہے، فرمایا تو میں یہ کہوں کہ اس میں خیر نہیں اور یہ جو تمھیں ترقی نہیں ملی تو تم اس کا خیال کر کر کے اپنا دل دُکھاتے رہو۔ میں بھی آپ سے یہی کہتا ہوں کہ آیا وہ اچھا تھا جو مَیں نے کہا یعنی اس میں خیر تھی اور خزاں کے بعد بہار آتی ہے یا یہ اچھا ہوتا کہ میں آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتا اور آپ کسی ایسے شخص کے ہاتھ پڑ جاتے جو آپ کو مایوس کرتا اور کہتا کہ اس میں کوئی خیر نہیں۔

بعض عنوانوں کو میں اس لیے مرثیہ کہتا ہوں کہ وہ اولاً آخراً ظاہراً باطناً طوعاً و کرھاً جبراً و قہراً "القصہ کلیۃً" رونے کے مضمون ہیں مثلاً قوم کے نام خطاب، یادِ ایامِ رفتہ اور رازِ دل کس کو سناؤں کوئی سنتا ہی نہیں۔ عنوان کیا ہیں ببول کا خارستان ہیں جدھر بھی قدم رکھوں کانٹے چبھتے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا اسی جنگل میں تھوڑے دن ہوئے قیس عامری ننگے پاؤں دوڑتا پھرتا تھا۔ پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لیے بیٹھا تو لیلیٰ کا ناقہ نظر سے غائب ہو گیا۔ ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی قیس عامری کی طرح . . . . . میرا مطلب پاگل ہونے کا نہیں کانٹا نکالنے کا ہے ۔ مگر اتنی فرصت کہاں ! آپ کو میرے پاؤں کے کانٹوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا اور اگر کانٹوں سے بچنے کے لیے آپ نے بوٹ پہن لیے تو یہی خار پا کی بجائے خار پہلو بن جائیں گے جس کی کھٹک سے آپ کا دل بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا ۔

ایک دفعہ یوم اقبال کے موقع پر جناب شورش کاشمیری نے لاہور کے شہریوں کی طرف سے مجھے "لسان پاکستان" کا خطاب دیا تھا اور بعض لوگوں نے اس خطاب کو اس طرح لکھنا شروع کیا جیسے "نشانِ پاکستان" ہو ۔ اُن کے خیال میں فرق صرف اتنا ہے کہ لسان کا "لام" نشان کے نون سے پہلے آتا ہے اور پھر "سین" نشان کے "شین" سے پہلے آتا ہے اور وہ محض ایک نشان ہے اور یہ پوری زبان ہے ۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ فرق اتنا ہے کہ سہ

اُس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے

لسانِ پاکستان کا خیال یُوں پیدا ہوا کہ اکثر اوقات لوگ دانستہ طور پر میری تقریروں سے غلط مطالب نکالتے ہیں : "میرے سادہ خیالات کو سمجھنے کے لیے نہ خیالات کو اُلٹانے کی ضرورت ہے نہ زیر جائزے کہ جب میں توشۂ کہوں تو آپ اس سے بوسے کا مطلب نکالیں ۔ ایسے آپ کو بوسہ چاہیئے تو کس نے روکا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں ، یہ ایک تسلسل خیالات کی مجبوری ہے اور تسلسلِ خیالی ایک نفسیاتی کیفیت ہے ۔ جس میں خیالات امواج بحر کی طرح ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ جب یہ موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو اُن سے تن تن ٹوٹ کر پھوار کی طرح برستی ہیں ۔ یہ ایک اور نفسیاتی کیفیت ہے جو آپ کی توجہ اور ہمدردی کی طالب ہے ۔ سہ

تہ ہے مرے آنسو سے گریبانِ تمنّا مجھ سا بھی نہ ہو کوئی پشیمانِ تمنّا

تر

اُردو کے بارے میں

حمید نظامی کا خیال تھا کہ میں اُردو لکھ سکتا ہوں۔ لکھنے کو تو میں ملتانی میں بھی لکھ سکتا ہوں مگر سچی بات یہ ہے کہ بہت دنوں تک میں ہیر کو ہیر رانجھا کے افسانے کا ہیرو سمجھتا رہا۔ یہ تو اب تک آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا۔ کہ مذکر اور مونث کے سلسلے میں میں اکثر غلطی کر جاتا ہوں۔ حمید نظامی کو اُس وقت تک میں نے نہیں دیکھا تھا مگر اُن کے نام سے میرا حوصلہ بڑھا اور ایک گونہ غیرت کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں اُردو میں تقریر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ویسے یہ بڑی جسارت کی بات تھی۔ پھر وہ تقریر حمید نظامی نے اپنے اخبار میں اِس طرح بڑھا چڑھا کر شائع کی اور چُپکے سے زبان کی غلطیاں بھی اِس طرح ٹھیک کر دیں کہ میں ایک پائے کا ادیب بلکہ ادیب لطیف بن گیا۔ اور لوگ اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجنے لگے وہ سارا کلام میرے پاس رکھا ہے۔ جب میں اپنی اصلاح سے فارغ ہو جاؤں گا تو اُس کی اصلاح کی طرف توجہ کروں گا۔

اب مجھے کچھ تعریف کرنی ہے کچھ اُردو زبان کی، کچھ زبیری صاحب کی، کچھ اُردو اکادمی کی اور ضمناً ایک آدھ لفظ اگر اپنی تعریف میں منہ سے نکل جائے تو آخر میں بھی انسان ہوں۔ زمانے کا کاروبار بھی اسی طرح چلتا رہتا ہے اور اُردو ادب کی خدمت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ اِس سے زیادہ کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ پٹھانستان کا ایک باشندہ دریاؤں اور صحراؤں کو تیز گامی سے عبور کر کے ڈائننگ کار کے باسی کھانے کی پرواہ نہ کر کے چولستان کے قریب اُردو اکادمی کا افتتاح کرے۔ میرے تو خوشی سے آنسو نکلنے لگے کہ میں اتنی خدمت یا کم از کم اتنی قربانی کے قابل ہوں۔ اِس اکادمی کی قسم مجھے بابر یاد آنے لگتا ہے جب وہ رانا سانگا سے لڑا تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ رہا ہے جب بابر نے شراب کے پیالے توڑ ڈالے تھے۔ میں بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ جیسے میں نے ساری پشتو ڈھا دی ہو، پٹھانستان توڑ دیا ہو۔ خوشحال خاں خٹک کو چھوڑ دیا ہوتا تاکہ

اُردو کو فروغ ہو۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ بعض دفعہ وزیرِ تعلیم ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کی علمی استعداد ذرا کم ہوتا کہ وہ اپنی لیاقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے دُوسروں کی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اُردو اکادمی کی صدارت کے لیے آپ نے مجھے کیوں منتخب کیا ہے مگر اب جو آپ نے مجھے چُنا ہے تو آگ لگے پٹھانستان کو۔

اِس بزم میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو وکلاء کی طرح صرف انگریزی پڑھتے رہے ہوں گے اور اُردو فارسی سے اُن کا سوتیلی ماں کا سا سلوک رہا ہوگا یعنی وہ جیسے سوتیلی ماں ہوں اور اُردو سوتیلا بیٹا اور اگر اُردو مؤنث ہے تو سوتیلی بیٹی۔ یہ تو مَیں نہیں جانتا، کہ اُردو مذکر ہے یا مؤنث۔ البتہ اتنا جانتا ہُوں کہ اگر کسی پٹھان نے کہا کہ مَیں نے اُردو سیکھا ہے تو اُردو دان پنجابی اُس پہ ہنسے گا اور کہے گا کہ اُس کو "اُردو سیکھنا نہیں چاہیے، سیکھنی چاہیے، بلکہ "سِکھنی چاہی دی اے"۔ مگر آپ کچھ کہیں پٹھانوں کی اُردو گرامر میں ایک ثابت قدمی اور سادگی ہے، ایک استقلال آئین اور قاعدہ کُلیہ ہے وہ یہ کہ پٹھان مرد صرف مذکر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور پٹھان عورت صرف مؤنث کا۔

مَیں نے پُوچھا کہ یہ اکادمی کیا بلا ہے۔ شبیر بُخاری صاحب کو بھی احساس تھا کہ یہ لفظ میری بساط سے باہر ہے۔ اُنھوں نے مہربانی فرما کر توضیح کی اور کہا کہ یہ انگریزی لفظ اکیڈمی کی تعریب ہے۔ اب اگر تعریب کا لفظ اکادمی سے کم ثقیل ہو تو آپ مجھے جاہیں سزا دیں۔ تعریب سے مطلب عربی کا رنگ دینا ہے۔ مگر میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ تعریب ہے یا تفریس۔ مَیں یہ پوچھ رہا تھا کہ اکادمی ہے کیا چیز؟ اس پہ بُخاری صاحب نے دستورالعمل کی ایک نقل دی جس کی دفعہ ایک میں لکھا ہے کہ اُردو زبان کے تحفظ، تحقیق و فروغ و اشاعت کا نام ہے۔ اُردو اکادمی یہ دستورالعمل پڑھ کر تو

میں سر سے پاؤں تک مُعرّب ہو گیا اور جسم سے عربی ٹپکنے لگی اور قرآن شریف بھی بھُول گیا۔ اب ذرا سنیئے دفعہ نمبر ۳۔

"اُردو اکادمی، تاریخ و ثقافت، زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون کے فروغ و ارتقا کے لیے ترجمہ و تالیف اور تحقیق و تصنیف کے مختلف شعبے قائم کرے گی۔ اُردو کے معیاری کتب کے تراجم کا دوسری زبان میں بندوبست کرے گی تاکہ بین الاقوامی افکار و معارف سے اُردو زبان و ادب متعارف ہو سکیں۔" ان جملوں میں سے آپ حروف جار اور "کرے گی" کے الفاظ نکال دیں تو باقی جو رہ جائے گا وہ اُردو اکادمی ہو گی۔ دستور العمل دیکھ کر غالب کے مقدّس کلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے بلکہ مجھے تو یہ معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اپنے اس مشہور شعر میں اُردو اکادمی کے قیام کی تاریخ کہی تھی۔ سے

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

بھاولپور میں تو شبیر بخاری نے صاف گوئی سے کہا تھا کہ یہ اُردو اکادمی ہے۔ مگر یہاں ملتان میں اُردو کا لفظ کسی مصلحت سے استعمال نہیں کیا گیا۔ ایک تو آغا شیر احمد خاں فارسی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں دوسرے اُردو کے لفظ کے نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے اگر وہ اکادمی کی کارروائی فارسی میں لکھ دیں تو کوئی مُعترض نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "گزشتہ سال کی روئیداد اکادمی کی اپنی زبان میں ہوتی تو اکادمی کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی" میں سوچتا ہوں کہ اکادمی کی زبان کون سی ہے ملتانی تو نہیں۔ آغا شیر احمد خاں المعروف بہ خموش جو بعض مقام پر اپنا نام راقم الحروف بھی لکھتے ہیں۔ اکثر خموشی سے اکادمی کی روئداد لکھتے ہوئے اُردو زبان کا مرثیہ بھی لکھ دیتے ہیں۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ اکادمی کی اپنی زبان کونسی ہے اور خموش صاحب کیوں اس

کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں میری نظر سے اُن کی وُہ رپورٹ گزری جو انھوں نے ممبرانِ اکادمی کو ۱۹۵۵ء میں پیش کی تھی۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"علم و ادب اور فن کے لیے صحیح ذوق اور فکر کی ترویج اور تربیت اُردو زبان کے علمی اور ادبی ذخائر میں عصرِ حاضر کے صحت مند تقاضوں کے مطابق مفید افکار کا اضافہ اور شعر و ادب کے لیے پاکیزہ ذوق کی اشاعت اور علم، ادب، فن کے ذریعے مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوقِ خدمت کی پرورش، یہ تھے وہ عزائم جو ملتان اکادمی نے اپنے لیے قبول کیے۔"

آپ کو معلوم ہو گا کہ کا، کے، کی حروفِ جار ہیں اور خوش صاحب کے اس مختصر سے کلام میں جو میں نے ابھی پڑھا ہے گیارہ مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ خوشا حروفِ جار! اگر یہ ملتان میں نہ ہوتے تو ہم کیسے پتہ لگا سکتے کہ خوش صاحب اُردو بول رہے ہیں یا فارسی۔

سجاد صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ کا ایک تقاضا میری قضا تک پہنچ گیا ہے۔ "تقاضے" کے لفظ پر مجھے محترم مدیر "چراغِ راہ" کا وہ سوال یاد آیا جو انھوں نے ازراہِ استفسار نہیں بلکہ ازراہِ زینتِ رسالہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "کیا اُردو زبان کا موجودہ رسم الخط کسی تبدیلی کا متقاضی ہے؟" میں نے جو جواب دیا اُس کی نقل تو میرے پاس نہیں ہے مگر وہ کچھ اس طرح پر تھا کہ اُردو رسم الخط نے خود تو کوئی تقاضا نہیں کیا کہ مجھے بدلا جائے مگر آپ کی یہی رضا ہے تو پھر اُردو کی قضا ہے البتہ انسان کی فطرت اِس بات کی متقضی ہوتی ہے کہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہیں کوئی اِس کو جدت کہتا ہے، کوئی بدعت اور کوئی تو انقلاب کے درجے تک پہنچا دیتا ہے اب چونکہ آپ کو اور کوئی تبدیلی نہیں سوجھتی اور شادیاں بھی چار سے یک لخت ایک

ہونے پر آپ کُلّتُ حَبِیبُ لَدِیبِدُ" کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اِس لیئے عُروسِ اُردو کو شریکِ حیات سمجھ کر اپنے جنسی میلانوں کی تسکین کے لیے اُس کو رومن اُردو کا فراک پہناتے ہیں۔

میرے خیال میں محترم پروفیسر خورشید احمد کو متقاضی کی بجائے متحمل کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ کیا اُردو رسم الخط بھی اتنی تبدیلی برداشت کر سکتا ہے کہ اُسے رومن کا جامہ پہنایا جائے مگر جامے کی تشبیہہ یہاں غلط ہے۔ اُس کا تو چہرہ ہی بدل جائے گا یہ محض لباس کا بدلنا نہیں ہے۔ رسم الخط کو تو زبان سے وہ تعلق ہے جو تن کو جان سے ہے۔ مَیں نے فراک کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ یہ اہلِ مغرب کا مخصوص لباس ہے اور غالباً اُردو کو رومن بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُسے مغرب کے لیے دلپذیر بنایا جائے۔ مگر آپ بھول رہے ہیں کہ کسی زبان کی اہمیت اُس کی اپنی خوبصورتی سے نہیں بڑھتی بلکہ اُس کے بولنے والوں کی خوبصورتی سے بڑھتی ہے۔ جب آپ اخلاقی طور پر صحت مند ہو جائیں گے تو آپ کی قومیت کا اعتبار قائم ہو جائے گا۔ اور دنیا آپ کی اُردو بھی سیکھے گی اور اُس کے رسم الخط کے نخرے بھی اُٹھائے گی۔ کاف کابل اور قاف قندھار کے باریک فرق کو دیکھ کر لوگ کہیں گے سبحان اللہ! محض حروف کے امتیاز میں یہ لوگ کتنی دُور چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی اپنی اصل پر نظر ہے ورنہ کاف کابل کی بجائے کاف کش مکش اور قاف قندھار کی بجائے قاف قسمت زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ یہ کش مکش جو ہم بلخ اور باختر کی جانب سے اٹھتی ہوئی دیکھتے ہیں واقعی قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ الغرض جب ہم صحت مند ہو جائیں گے تو اُردو کی ساکھ اتنی بڑھ جائے گی کہ گندھارا سنگھ بھی تعریفی لہجے میں کہنے لگے گا "اُردو دیاں نوجاں ایّاں"۔

اسی طرح خودی کا لفظ لیجئے جب اُردو بولنے والے مستقل مزاج ہو جائیں گے تو

دنیا والے خودی کے لفظ کو سن کر یہ اعتراض نہیں کریں گے کہ یہ نہ تو معروف ہے نہ مجہول بلکہ یہ کہیں گے کہ خودی میں جو خودداری پوشیدہ ہے وہ خودی کے واؤ کے برعکس سُننے میں آتی ہے دیکھنے میں نہیں آتی مگر اس وقت تو آپ کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے اِس وقت اگر آپ نے پورا اسم الخط بدلنے کا نخرا کیا تو اُس کی حیثیت ایک شترِ غمزے کی سی ہو گی۔" لیجیے میں ختم کرتا ہوں تاکہ آپ زیادہ ناراض نہ ہوں۔ مگر آپ کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ میں اُردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ ورنہ جانے آپ اِس کو کتنی غیر زبانوں کے سینگ لگا بیٹھیں گے۔ یہ تو پہلے ہی بارہ سینگا ہے۔

سیاست کے بارے میں

مجھے نہ سیاست سے کام ہے نہ سیاست کو سمجھتا ہوں۔ البتہ اِس بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ لوگ بزدل نہ ہو جائیں اور اُن کے حوصلے پست نہ ہوں اور اُن کے خیالات دب کر اُن کے جذبۂ انسانیت کو مجروح نہ کر دیں۔

مگر اے اصحابِ کہف! یاد کرو وہ دن جو ۲۳ مارچ کا تھا اور سن چالیس[40] میں اِس شہر لاہور میں تم نے مسلم لیگ بنا کر قائدِ اعظم کی سرپرستی میں پاکستان ریزولیوشن پاس کیا تھا اُس سے پہلے تم "لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" کی حیثیت رکھتے تھے یعنی قابلِ ذکر چیز نہیں تھے۔ اس سے پہلے پاکستان محض ایک خیالی تھا اور جب اِس قرارداد کی رُو سے یہ طے ہوا کہ اب مسلمان کا مطمحِ نظر اپنے لیے ایک علیٰحدہ مملکت پیدا کرنا ہو گا تو اِس کی تائید کرنے والے قیامِ پاکستان کو ایک کھُلا امکانِ بعید ہی سمجھتے تھے۔ یہی خیال تھا کہ اگر ہم علیٰحدہ ہونے کی دھمکی دیں گے تو شاید ہمیں مشترکہ ہندوستان میں زیادہ حقوق مل سکیں۔ مَیں خود تو وہاں موجود نہ تھا۔ اِس لیے اِس بات کی ذمہ داری راوی پر ہے جو اِس صورت میں راجہ غضنفر علی خاں ہیں اور جو دریائے راوی کی طرح رواں قصّے سُنایا کرتے ہیں۔ اُن کی روایت ہے کہ اصل قرارداد سے

سکندر حیات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اندر دو صوبے مسلمانوں کے ہوں گے جو امورِ خارجہ اور دفاع کی حد تک دوسرے صوبوں کے ساتھ اشتراک کریں گے۔ مگر قائدِ اعظم نے اس میں دو لفظ تبدیل کر دیئے۔ جس سے قرارداد کا چہرہ بدل گیا۔ چہرے پر تو صرف دو خال لگائے گئے ایک پنجاب کی کشادہ پیشانی پر، دوسرا بنگال کے چاہِ زنخداں پر، مگر اُس میں اتنی کشش پیدا ہو گئی کہ وہ دو صوبے آزادی کے طالب ہوئے۔

ایک شاعر تھا جس کا نام خواجہ حافظ تھا۔ اور اُس نے خالِ ہندو کے بدلے سمرقند و بخارا بخشنے کا وعدہ کیا تھا۔ ؎

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

شرط صرف اتنی تھی کہ کوئی ہمارے دل کو ہاتھ میں لے "بدست آرد دلِ ما را"، یعنی محبت سے رام کرے۔ لوگ سمجھے کہ یہ محض عشقِ مجازی کی کارگزاری ہے مگر آپ نے نہیں سُنا کہ ؎ "دل بدست آور کہ حجِ اکبر است"۔ اِس لیے دل کا ہاتھ میں لے لینا کوئی جبری کیفیت نہیں بلکہ ایک نفسیاتی معراج ہے۔ مگر حافظ ہر بات کو اپنے رنگیلے طرز میں پیش کرتا ہے اور بدخواہوں نے تیمور کے پاس جا کر اُس کی چغلی کھائی کہ دیکھئے حضور! آپ نے تو اتنی محنت سے سمرقند و بخارا فتح کیے اور یہ شخص ایک سیاہ خال کے بدلے اُنہیں مفت بخش رہا ہے۔ تیمور نے ناراض ہو کر حافظ کو بُلایا اور اُس سے جواب طلب کیا کہ تم کیوں ایسی بخشش کرتے ہو اُس نے جواب دیا کہ یہی غلط بخشیاں تو ہیں جنھوں نے مجھے اِس حال تک پہنچا دیا ہے۔ بادشاہ را خوش آمد اور وہ سمجھا کہ میری حالت حافظ سے بہتر ہے مگر حافظ اصل بات تو اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا مطلب تو یہ تھا کہ ایک خالِ ہندو کے بدلے دو صوبے مل سکتے ہیں چنانچہ اِس شعر کی تعبیر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی مگر احتیاط کا پہلو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان ریزولیوشن کے ہندی چہرے پر ایک کی بجائے دو خال لگائے گئے یہ خال کیا گئے

گویا چار چاند لگ گئے۔

اِسی طرح مردوں نے اپنے نام کا زبر ہی بدل دیا ہے اور زیر وزبر ہو کر مُردوں کی طرح پڑے سے رہے۔ اب تک ان کو سوتے ہوئے چودہ سال اور سات مہینے ہو گئے ہیں (۱۹۴۷ء سے آج تک) وہ کبھی کبھی ایک آنکھ کھول کر پڑے پڑے حالات کا جائزہ لے لیتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر کہ ہم تو اصحابِ کہف ہیں ابھی ہماری نیند کی میعاد نہیں گزری۔ وہ ایک آنکھ بھی بند کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ آنکھ کھولتے کب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد جیسے کوئی باقاعدہ گھنٹی بجاتا ہو۔ پانچ سال اور پانچ مہینے کے باقاعدہ وقفوں کے بعد انھوں نے دو دفعہ آنکھ کھولی مگر سہ

چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد

آنکھ کھولی تو ایک نیا عالم تھا یعنی مارشل لا ء تھا۔ اُن کی نرگسی آنکھیں وہ حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ جن و ملک یعنی بُرے اور بھلے اپنی پرواز میں رُک جاتے ہیں۔ اختلافِ لیل و نہار نہیں رہتا یعنی رات ہی رات رہ جاتی ہے اور دل و دماغ، آئین و قانون سب کچھ معطل ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ پانچ سال اور پانچ ماہ کے بعد اگر کبھی چھ مہینے ہو گئے ہوں تو میرا قصور نہیں۔ ماہِ رمضان کا قصور ہے جو کبھی اٹھائیس دن کا ہوتا ہے کبھی انتیس دن کا۔ اور یہ محض ایک روایت ہے کہ کسی زمانے میں تیس دن کا بھی ہوا کرتا تھا۔ تیسواں دن اب عموماً بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔ اب یہ پانچ سال اور پانچ مہینے کا تیسرا وقفہ نومبر یا دسمبر ۷۶ء میں آئے گا۔ ٹھیک تاریخ کا مُعیّن کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو جس چیز کو رویتِ ہلال کہتے ہیں وہ ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ دوسرے اِس بات کا پتہ نہیں کہ اصحابِ کہف اب کے عیسوی سال منائیں گے یا ہجری۔

قائدِ اعظم سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے دسمبر کا مہینہ بہتر ہوگا تاکہ جنم دن کی رونق برقرار رکھنے کے لیے کوئی اور ہنگامہ میسر ہو۔ اب تو صرف خیرات ہی کرتے ہیں۔ شاید اس خیال سے کہ مبادا قائدِ اعظم دوسری مرتبہ پیدا ہوں اور اصحابِ کہف کو اپنی میٹھی نیند سے جگائیں، یا اس شکر یے میں کہ اُن کی وفات ٹھیک وقت پر ہوئی ورنہ ہمیں پوری طرح جگا کر ہی چھوڑتے اور ہماری نیند خراب کرتے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم جاگیں۔ کیا ہم ہی جاگتے رہیں اور لوگ جاگنے کے لیے تھوڑے ہیں۔

اِس پر سب متفق ہیں کہ جمہوریت لاقانونیت کے منافی ہے۔ اِس پر بھی سب متفق ہیں کہ جمہوریت دنیا کی ایک روحانی غذا ہے۔ اگر کسی ضرورت کے تحت صاحبانِ اقتدار ایک عرصے کے لیے جمہوری نظام کو معطل کردیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ تعطل کے دن تعطیلات کے دنوں کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں۔ اب نہ وہ عشق میں گرمی رہی نہ پشاوری کلچوں میں وُہ شوخی۔ مگر پھر بھی ہر دَور میں یہ کوشش رہتی ہے کہ گندے انڈوں کو الگ کرکے ایبڈو کر دیا جائے۔ اور اب یہ ایبڈو ایک قسم کا سرد خانہ بن گیا ہے جس میں سنگترے، ٹماٹے اور آلو کے علاوہ گندے انڈے بھی رکھے جاتے ہیں۔

چنانچہ اب ایسا نظر آتا ہے کہ یہ گندے انڈے یا جن کو آپ نے گندا کہا تھا۔ ایبڈو کے سرد خانے میں رہ کر صحیح و سالم ہوگئے ہیں اور اس لیے آپ یا تو "ما را چہ ازایں قصہ" کہہ کر جب انڈوں کو گندا کہا جائے تو کہیں کہ کیا مضائقہ ہے اور جب انڈوں کو اچھا کہا جائے تب بھی کہیں کیا مضائقہ ہے اور یہ صورت آرام کی ہے کیونکہ آپ کو سوچنا نہیں پڑتا یا پھر اگر فطرت نے آپ کو سوچنے کی لعنت میں مبتلا کیا ہے تو ایک ذہنی انتشار کے عالم میں آپ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ کیا سچ مچ یہ انڈے گندے تھے یا سیاست میں انڈے گندے ہی ہوا کرتے ہیں۔

مجھے انتخابات کے زمانے کا ایک قصہ یاد آگیا۔ ووٹ ایک امیدوار کے

ساتھ زیادہ تھے مگر سرکار دوسرے اُمیدوار کے ساتھ زیادہ تھی اور اس کے حق میں کھلم کھلا فرضی ووٹ ڈالے جا رہے تھے۔ انتخاب کی نگرانی ایک تحصیلدار کر رہا تھا۔ آزردہ اُمیدوار نے اس دھاندلی پر شکایت کی۔ تحصیلدار نے کہا کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس شکایت کرو۔ اُمیدوار نے جواب دیا وہاں بھی شکایت کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔ تحصیلدار نے کہا چیف منسٹر کے پاس شکایت کرو۔ اُمیدوار نے کہا وہاں بھی شکایت کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔ تحصیلدار نے کہا تو کیا اتنے لوگوں میں ایک میں ہی آپ کو دیانت دار نظر آتا ہوں؟ میں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟ اور میں نے کیا قصور کیا ہے؟

معاشرے کے بارے میں

معلوم نہیں مُلتان اکادمی گانے کو جائز سمجھتی ہے یا نہیں۔ پاکستان آرٹ کونسل میں تو ہم گانا بھی جائز سمجھتے ہیں اور بجانا بھی۔ تیسری چیز، یعنی ناچ کو بھی، جو اِن دونوں سے بہتر ہے۔ بہت سی چیزوں کو آپ مکان و زماں کے اعتبار سے جائز بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ناچنے اور گانے کو محفلِ رقص و سرود کہا جائے اور اُس کا افتتاح کسی معتبر آدمی سے کرایا جائے اور وہ بازار کے بالا خانے کی بجائے کسی بنگلے میں ہو تو اُسے آرٹ کہتے ہیں۔ اور اُس کا شمار فنونِ لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک سرکاری ملازم کے خلاف یہ جرم قائم ہوا کہ اُس نے ایک گانے والی عورت کو کچھ زمین دلوائی تھی۔ اُس نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ تو آرٹسٹ ہے۔ جس زمین کی خرید و فروخت پر یہ تنازعہ پیدا ہوا تھا اُسے بھلا کر بحث اِس بات پر شروع ہو گئی کہ خریدنے والی آرٹسٹ ہے یا محض گانے والی۔ چونکہ سرکار کا پلہ بھاری تھا۔ وہ آرٹسٹ گانے والی ہی رہی۔ مگر کیا کوئی گانے والی قیمت دے کر بھی زمین نہیں خرید سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بیچاری آسمان سے بھی محروم رہے اور زمین سے بھی۔ آجکل یادگاروں کے دن ہیں۔ سنا ہے اب پاکستان کی یادگار بننے والی ہے

جیسے آپ خود کم یادگار ہوں۔ جیسے آپ کی کاروباری دیانت داری بجائے خود ایک یادگار نہ ہو۔ مگر سُنا ہے کہ آپ مجسموں سے گھبراتے ہیں کیونکہ بُت پرستی دینِ احمدیؐ میں کہیں نہیں آئی۔ جہاں بُت دیکھا آپ نے توڑ ڈالا خواہ لارنس جیسے نیک دل شخص کا ہی کیوں نہ ہو۔

میں مجسموں کا ذکر کر رہا تھا اور یہ کہ بُت پرستی حرام ہے اور بُت شکنی حلال۔ البتہ اتنی فراخدلی ہم میں ضرور ہے کہ یہ حلال و حرام کا سلسلہ صرف پتھر کے بُتوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ باقی ہمارے بُت بھی ہیں اور بُت خانے بھی اور اُن کی پوجا پرا بھی تک کسی اہلِ شرع نے اعتراض نہیں کیا بشرطیکہ اس پر اللہ کا نام پڑھ لیا جائے۔ ~

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے

اے برہمنو! اگر بُرا نہ مانو تو مجھے آپ پر شک ہے۔ کیونکہ جن مورتوں کی آپ پرستش کرتے ہیں وہ تو پتھر کی طرح سخت ہیں۔ ان کے بل کیسے نکل سکتے ہیں اور اسی مناسبت سے آپ کے نظریے بھی سخت ہیں یعنی ٹھوس اور جامد قسم کے جن میں لچک نہیں ہوتی اور اُن کے بل نکلیں تو وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ بدل نہیں سکتے۔ اگر آپ اپنے نظریوں میں بحث اور اصلاح کی گنجائش رکھیں تو کیا مضائقہ ہے ویسے پتھر بھی تو تراشے جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہمارے لوگ اتنے اچھے ہیں۔ سارا سال پھولوں کے ہار تیار رکھتے ہیں۔ اور بلاتفریق مذہب و ملت، بلا تفریق رنگ و بو، بلا تفریق دل و دماغ ہر ایک کو پہناتے ہیں اور اس کے لیے صرف ایک ہی شرط ہے وہ یہ کہ پھول پہننے والا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ . . . . . جو باتیں آپ کے نزدیک ارشادات ہیں وہ دراصل میری آرزوئیں بن گئی ہیں۔ میری پہلی آرزو یہ ہے کہ اپنے بچوں سے کہوں

بیٹا ہم تو ہار پہنانے کے ماحول میں پیدا ہوئے ہم نے تو اپنے آبا ؤ اجداد کو یہی ہار پہناتے دیکھا ہمیں تو عادت ہوگئی ہے۔ مگر خدا کے لیے تم ہاروں سے دور رہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کسی کی قدر نہ کریں۔ بس یہ کہتا ہوں کہ آپ کسی کو دھوکہ نہ دیں۔ یہ آپ کے بڑے افسر امیر وزیر عموماً اچھے لوگ ہوتے ہیں مگر صبح وشام جھوٹ سن سن کر ان کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کا ماحول مرطوب آب وہوا کی طرح ہے جس سے کوتاہ نفسی کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔

گداگری بھی تو ہماری سرشت میں ہے۔ گداگر بھی تیار کھانا مانگتا ہے اور ہم بھی تیار چیزیں مانگتے ہیں۔ جو محنت کے بغیر حاصل ہوں۔ خدا نے انسان کو بہترین فطرت دے کر پیدا کیا یعنی ایک ایسی فطرت دے کر جو سوچنے سمجھنے پر مائل ہے۔ پھر پیٹ دے کر پست کر دیا اور وہ بھیک مانگتا ہے۔ کبھی اکیلے فقیر کی صورت میں، کبھی قومی حیثیت میں دوسری قوموں سے۔ اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کہ خراج مانگنے والے بھی فقیر ہوتے ہیں۔ سے

کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

اے اصحاب کہف! مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی کل تعداد کتنی ہے بعض کہتے ہیں کہ آپ تین ہیں اور چوتھا آپ کا کتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ پانچ ہیں اور چھٹا آپ کا کتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ سات ہیں اور آٹھواں آپ کا کتا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر کتا ہر حالت میں آپ کے ساتھ ہے اور اگرچہ کتا ایک وفادار جانور ہے اور آپ کو ان بنیادی اصولوں سے جو خدا نے آپ کی پیدائش کے ساتھ تخلیق کیئے تھے وفاداری سکھاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی باؤلا بھی ہو جاتا ہے اور کاٹتا بھی ہے۔ ایک شخص کو باؤلے کتے نے کاٹا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں انجکشن تو لگا دیتا ہوں مگر پھر بھی آپ پر باؤلے پن کا اثر ہو جانے کا احتمال ہے اور یہ بھی اندیشہ

ہے کہ نوبت آپ کے وصال تک پہنچ جائے گی۔ بہرحال میں شام کو پھر آؤں گا۔ شام کو گیا تو دیکھا کہ وہ شخص زور شور سے کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر سمجھا کہ وصیت لکھ رہا ہے خوش ہو کر کہا کہ آپ بڑے سمجھ دار انسان ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا "کیا مجھے باولے کتے نے کاٹا ہے کہ وصیت لکھوں۔ میں تو اُن لوگوں کی فہرست بنا رہا ہوں جنھیں باولا ہو کر میں خود کاٹوں گا"

مالیات

کسی نے مجھ سے ایک دن پُوچھا کہ یہ سرکار کون ہے؟ میں نے پہلے اُس کو سمجھایا کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ کیا ہوتا ہے اور بجٹ کیسے بنتا ہے یعنی جس حد تک میں خود فنانس ڈیپارٹمنٹ اور بجٹ کو سمجھتا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایک فنانس منسٹر ہوتا ہے اور ایک فنانس سیکرٹری اور جب وہ دونوں کسی مالی مطالبے کے متعلق لکھتے ہیں کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ اتفاق نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات ایگری نہیں کرتے۔ مگر اب میری سمجھ بڑھ گئی ہے۔ فنانس ڈیپارٹمنٹ ایک بڑا محکمہ ہے جس میں مذکورہ بالا دو صاحبان کے علاوہ اسسٹنٹ بھی ہوتے ہیں۔ اب سیکشن افسر بھی آ گئے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک لکھتا ہے کہ اگر ہائیکورٹ کا ہر جج اتنا کام کرے جتنا سب نے مل کر ۶۵۸ میں کیا تھا تو چار ایڈیشنل ججوں کی بجائے تین کافی ہوں گے۔ اور اخیر میں یہ کہ ہمیں ایگری نہیں کرنا چاہیئے۔ اِس پر اطلاع آتی ہے کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ ایگری نہیں کرتا بلکہ اکثر تو صرف ایف ڈی لکھ دیتے ہیں۔

جنگلات

اب مجھے یوم درختاں یاد آیا ہم ہر سال سُنتے ہیں کہ پاکستان کا صرف دو فیصد یا دو اعشاریہ ایک صفر صفر ایک (۲۰۱۰۰۱) فی صد رقبہ زیر جنگلات ہے جو کم از کم پندرہ فی صد تو ہونا چاہیئے۔ پھر سُنتے ہیں کہ اِس سال ۶ راگست کو دس لاکھ بہتر ہزار چار سو اناسی (۱۰۷۲۴۷۹) درخت کاشت

ہوئے اور پندرہ فروری کو چار سو اناسی (۴۷۹) کی بجائے چار سو اسّی (۴۸۰) کا شت ہوئے۔ وہ ایک فالتو درخت میں نے کاشت کیا تھا اور جہاں تک مجھے اِس حال سے نظر آرہا ہے۔ صرف وہی ایک درخت اِس وقت کھڑا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ باوجود اتنی کاشت کے جنگلات کا رقبہ ۱۹۵۰ء سے اب تک وہ اعشاریہ ایک صفر صفر ایک ہی کیوں چلا آرہا ہے؟

کبھی سرکار نے پوچھا کہ یہ چار ہزار درخت یہاں اور آٹھ ہزار وہاں اور دس لاکھ سارے صوبے میں جو ۱۹۵۰ء میں لگے تھے اُن میں سے کتنے پودے باقی رہ گئے ہیں؟ اگر سرکار کا پرائیویٹ باغ ہوتا تو ایک درخت کے سوکھنے پر مالی کی جان پر بن جاتی۔ لیکن سرکار مؤنث ہونے کے سبب جان نواز ہوتی ہے، کم از کم مالی کی حد تک "پنبہ کجا کجا نہم"۔

زراعت

ایگری کلچر سپیشلسٹ آیا ..... میں نے چیری کے درخت دکھائے جن کے پتّے کسی کیڑے نے کھا لیے تھے مگر کیڑا غائب تھا ...

اُس نے کہا کہ یہ ایک کیڑا ہے جو پتّے بھی کھاتا ہے اور بھاگ بھی جاتا ہے ....

میں نے پوچھا آخر اِس کا علاج کیا ہے؟ کہا علاج ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جو درختوں پر چھڑکا جاتا ہے اور جسے کھا کر کیڑے مر جاتے ہیں مگر اب تو زہر بھی ضروری نہیں ہے اِس لیے کہ عنقریب کیڑوں کا موسم گزر جائے گا اور اسی لیے شاعر نے اِس عیار کیڑے کی طرف سے کہا ہے۔ سے

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اور اے اہلِ بصیرت دیکھو کہ موسم کے ردّ و بدل میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ آئندہ سال پھر پتّے نکلیں گے اور پھر کیڑے پتّوں کو کھالیں گے اور درختوں پر زہر چھڑکنے سے پہلے پھر کیڑوں کا موسم گزر جائے گا لیکن زراعت کا محکمہ اسی طرح

برقرار رہے گا۔

تعمیرات

کتابوں کی نمائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ایک اُردو ڈکشنری نظر سے گزری میں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈبلیو ڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈبلیو ڈی سے کیا مراد ہے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کا محکمہ۔ بریکٹوں میں لکھا تھا مؤنث، یعنی پی ڈبلیو ڈی کا لفظ مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہوئی کہ یہ محکمہ ابھی مؤنث ہے اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزرتے۔

انتظامیہ کے بارے میں

کبھی کبھی لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ہر دلعزیز بننا چاہتا ہوں۔ لوگوں سے میرا مطلب آپ لوگ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو انگریزوں کی آیا "بابا لوگ" کہتی ہے۔ آپ بھی ان کو "بابا لوگ" ہی کہیں کیونکہ بابا لوگوں کی تربیت کا ایک ضروری حصہ گدھے کی سواری ہے۔ اُن کو یہ تربیت اِس لیے دی جاتی ہے کہ آئندہ زندگی میں وہ ہر ایک کو گدھا سمجھ کر اُس پر سوار ہو جایا کریں۔ میں نے تو گدھے کی سواری اُس دن سے چھوڑ دی ہے جب چھ سال کی عمر میں میرے ایک ہم عمر نے مجھے گدھے پر بٹھا کر اُسے چھڑی لگا دی میں فوراً گر گیا اور میری ناک پھول گئی اور ہو سکتا ہے کہ ابھی تک پھولی ہوئی ہو لیکن اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ میں "بابا لوگ" کی طرح کسی کو گدھا سمجھ کر اس پر سوار نہیں ہو جاتا۔ دوسرے یہ کہ میرے خیالات کا گدھا پن صرف ناک تک محدود رہا، اِن "بابا لوگوں" کا تو سر تک چڑھ جاتا ہے۔

جب سے "بابا لوگ" نے "لسان" کا لفظ سُنا ہے وہ کچھ حیرت اور کچھ بے اعتنائی کے ساتھ اپنے کندھوں کو ایک خاص انگریزی جنبش دیتے ہیں۔ گویا یہ کہہ رہے ہوں۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

خدا کرے کہ میری زبان ترکی ہی رہے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ترکی بہ ترکی کا محاورہ بلاوجہ استعمال نہیں ہوا۔ مگر بعض لوگ ترکی کا جواب لاطینی میں دیتے ہیں، جیسے محاورے کے بموجب کوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔

ایران میں ایک شاعر تھا جس کا نام خواجہ حافظ تھا اور اُس نے خالِ ہندو کے بدلے سمرقند و بخارا بخشنے کا وعدہ کیا تھا۔ . . . . بدخواہوں نے تیمور کے پاس جا کر اس کی چغلی کھائی کہ دیکھئے حضور! آپ نے تو اتنی محنت سے سمرقند و بخارا فتح کیئے اور یہ شخص ایک خالِ سیاہ کے بدلے اُنھیں مفت بخش رہا ہے۔ یہ چغلی کھانے والے ہر عہد میں ہوتے ہیں اور حافظِ قلندر منش کے خلاف تیمورانِ زمانہ کو اُکساتے رہتے ہیں۔ خود نہ تو سمرقند و بخارا فتح کر سکتے ہیں نہ بخش سکتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی بخشش سے روکتے ہیں اور بخشیش بھی کس چیز کی؟ صرف ایک فکرِ آزاد کی، جو دل کے تاریک ویرانوں میں اُجالا کر دے۔

عدلیہ کے بارے میں

وَالسَّمَآءَ وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ تین دفعہ میزان کا ذکر آیا ہے۔ آسمان کو اونچا کر کے انسان کے لیے توازن کا اصول قائم کر دیا تاکہ میزانِ عدل میں کجی نہ آئے اور فرمایا کہ توازن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان کو خسارے میں نہ ڈالو۔ مگر جہاں قدرت نے آپ پر میزان کی اہمیت اتنی صراحت سے واضح کی ہے وہاں اِس کا بھی خیال رکھا ہے کہ بعض دفعہ آپ کے خیالات میں طغیانی آجاتی ہے اور دیگر چیزوں کے ساتھ خودداری کا مال و متاع بھی بہہ جاتا ہے۔ اِس لیئے قدرت نے آپ کی سرشت میں بھی توازن رکھا تاکہ اپنے کردار کے باوجود آپ ڈوب نہ جائیں بلکہ تیرتے رہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس کونسی عدل و انصاف کی راہیں ہیں؟ کچھ قانونی رکاوٹیں

ہیں، کچھ رکاوٹیں ہم خود پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسے کسی وکیل کو خوش کرنے کے لیے ہم حکم امتناعی جاری کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں سینیئر جج تھا ایک شخص کا مقدمہ زائد المیعاد ہونے کی وجہ سے خارج ہوا۔ اُس نے کہا کہ یہ عدالت تو نہ ہوئی میں نے تلخی سے جواب دیا، تلخی میرے دل میں تھی زبان پر نہ تھی، اور تلخی کا سبب یہ تھا کہ میں بے اختیار تھا میں نے کہا "کون کہتا ہے کہ یہ عدل و انصاف کی جگہ ہے۔ یہ تو کچہری ہے اور آپ یقین جانیئے کہ میری ساری عدالتی زندگی اسی عدالت اور کچہری میں توازن قائم کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ ہائی کورٹ میں جس کو لوگ عدالتِ عالیہ کہتے ہیں اگر کبھی ایسی کوشش میں نے کی . . . . مگر خیر اُن کوششوں کا ذکر چھوڑیئے ہم تو ابھی تک عدل و انصاف کی پگ ڈنڈیوں پر چل رہے ہیں۔ شاہراہیں تو ملی ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں دیانت سے کام کریں۔

ہمارے جج صاحبان اور وکلاء صاحبان قانون میں بہہ جاتے ہیں اور قانون کا اصل مقصد نہیں دیکھتے کہ عدل و توازن ہے۔ القصہ آپ زندگی کے عام معاملوں میں بھی عدل و توازن پیدا کریں اور ایک طرف نہ بہہ جایا کریں۔

اِس سال جسٹس سجاد کے پرچے میں بریکیٹ بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک سال ہائی کورٹ میں رہ کر انھوں نے شاید محسوس کر لیا ہے کہ ساری جوڈیشری بریکٹوں میں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اِس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ بریکٹوں کے باہر کی آلائشوں سے پاک ہیں۔ آپ کہتے ہیں (جب میں آپ سے کہوں تو آپ اپنے کو بریکٹوں میں ڈال دیا کریں جس کا مدعا یہ ہوگا کہ حاضرین کے سوا باقی سب) کہ ہم اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ ہم کو بریکٹوں میں بند کر دیا گیا ہے۔ شائستہ قوموں نے عدل و انصاف کے تصور کی تشکیل اسی طرح کی ہے۔ کہ اس کا مجسمہ یا تو ایک آنکھ کے ساتھ بنایا ہے یا بغیر

آنکھ کے۔ ایک آنکھ سے مراد یہ ہے کہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھا جائے اور اندھا ہونے سے یہ مطلب ہے کہ انصاف کی ترازو چشمِ ظاہر بین کے فریب سے متاثر نہیں ہوتی۔ انصاف کا مجسمہ بینائی سے تو محروم ہوتا ہے لیکن گویائی سے محروم نہیں ہوتا۔ یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ اُس کے ہونٹوں پر مُہر ہو یا وہ سِلے ہُوئے ہوں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ مجسّمے کا لفظ نہیں سمجھتے وہ اُسے بُت کہتے ہیں اور بُت تو جب ہی دلپذیر ہوتا ہے جب صنم بن کے آئے۔ ورنہ جب لوگ کہتے ہیں کہ بُت کی طرح کیوں کھڑے ہو تو اُن کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آخر منہ میں زبان رکھتے ہوئے دل میں تڑپ رکھتے ہوئے سر میں سمجھ رکھتے ہوئے کچھ تو مُنہ سے بولو۔ اب یہ تو صاف بات ہے کہ اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں آپ کے دلوں میں بُت بن کے آؤں یا صنم تو میں صنم بن کے آنا پسند کروں گا اور اسی طرح آپ کا شکریہ بھی ادا کر سکتا ہوں۔ ؎

جو دل میں ہے آنا صنم بن کے آ
خدا بن کے آنے سے کیا فائدہ

سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور پھر کئی صدیاں

معاصرین کے بارے میں:۔ چھوڑ کر اقبال اور قائداعظم پر نگاہ ٹھہرتی ہے۔

قائداعظمؒ —— ۱۹۴۶ء کی گرمیوں میں میں شملہ گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان بننے سے پہلے کا وہ زمانہ کس طرح ہنگاموں سے پُر تھا۔ قائداعظم بھی کسی کانفرنس کے سلسلے میں وہیں تھے۔ مدت سے میری آرزو تھی کہ قائداعظم سے ملوں۔ چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ کر اُن کے مکان پر گیا۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ جب میں اُن سے ملا تو میں نے اُن کو مفید مشورہ دیا جس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ مجھے دس سال پہلے ملے ہوتے تو پاکستان پہلے بن گیا ہوتا، تو آپ مان لیں گے اور کئی لوگوں نے آپ سے ایسی باتیں سنائی ہوں گی کیونکہ قائداعظم تو اب اُن کی تردید نہیں کر

سکتے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں اُن سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہ ملے اور میرے دل میں اُن سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔ میں نے اُن کے سیکرٹری کو بتایا کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں اُس نے پوچھا "کوئی کام ہے" میں نے کہا کہ کام تو کچھ نہیں صرف تمنائے زیارت کھینچ لائی ہے۔ اُس نے کہا۔ پھر وہ آپ سے نہیں ملیں گے میں نے کہا۔ آپ میرا کارڈ تو لے جائیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی سی ایس دیکھ کر وہ یہ تو سمجھ جائیں گے کہ محض شاعر نہیں ہوں جو وادیوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ وَیَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ (اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں) مگر کیا پتہ کہ سیکرٹری نے کارڈ دکھایا یا نہیں۔ اگر نہیں دکھایا تو خدا اُسے نہ بخشے۔ واپس آ کر اُس نے میرے کارڈ کے ساتھ مجھے بھی واپس کر دیا۔ میں باہر نکل کر ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کسی سے کہا جائے کہ تم نوکری سے ڈسمس کر دیئے گئے ہو۔ کچھ دیر کھڑا رہا تاکہ سر میں جو چکر کی کیفیت تھی اُس پہ قابو پالوں پھر رکشا کی طرف چلا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ رکشا میں سوار کوئی اُن کے گھر سے نکلا۔ اخباروں میں جو تصویریں نکلا کرتی تھیں اُن سے میں نے پہچان لیا کہ یہی قائداعظم ہیں۔ میرا پژمردہ چہرہ ایک دم تازہ ہو گیا اور میں نے فورِ شادمانی میں بڑے اشتیاق سے سلام کیا انھوں نے ایک کشادہ تبسّم سے میرے سلام کا جواب دیا۔ بس میں سمجھا کہ میری زیارت ہو گئی ہے۔

۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو ملاقات کی حسرت مٹانے کا پھر ایک موقع آیا۔ گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں وہ بطور گورنر جنرل قیام پذیر تھے۔ ہم سب کو دعوت نامے آئے اور ساتھ ایک ایک کارڈ بھی جس پر اپنا نام لکھنا تھا۔ تاکہ اُس کارڈ کو دیکھ کر گورنر صاحب کو تعارف کرانے میں سہولت ہو۔ میں بڑے شوق سے چلا۔ عبدالعزیز خاں جو اَب ہمارے ایک جج ہیں میرے ساتھ تھے۔ راستے میں ایک مقام پر سڑک کی مرمّت ہو رہی تھی موٹر کار کا ایک پہیہ وہاں گر گیا۔ میری موٹر کا پہیہ سال میں ایک دو بار ضرور کسی

ایسی ہی جگہ گزرتا ہے۔ اس چھوٹے سے حادثے کی وجہ سے ہم تقریباً آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔ تعارف کی تقریب ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ گویا میں وہاں بھی قائدِ اعظم سے ہاتھ ملانے سے محروم رہا۔ دُور ہی سے دیکھتا رہا۔ گو بہت عقیدت اور فخر سے دیکھتا رہا۔ اِس آرزو کی راکھ میں ایک دفعہ پھر گرمی پیدا ہوئی جب کئی سال بعد میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے ہاتھ ملایا۔ یہ واقعہ چودھری نذیر احمد خاں مرحوم کے مکان پہ ہوا۔ آدھا ثواب اُن کی روح کو ملا۔ مرحوم سے کہیں یہ نہ سمجھیے گا کہ خدانخواستہ وہ سُرگباش ہو گئے ہیں وُہ بالکل زندہ ہیں بلکہ اِس وقت بھی موجود ہیں۔ مرحوم کا مفہوم جو کچھ ہو میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ اُن پر رحم کرے۔ کیونکہ وہ اب اٹارنی جنرل ہو گئے ہیں اللہ بخشے اُنھیں جب بخشنے کا وقت آئے۔ بیچارے اچھے آدمی تھے۔ ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی سنا دیتے تھے۔ مگر میری نظر اُن کے کسی اور پہلو پہ رہتی تھی وہ کبھی کبھی کوئی خطبہ پڑھتے تھے تو اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے اور اُس کی نقل میرے پاس بھی بھیج دیتے تھے۔ مَیں پڑھ کر خُوش ہوتا تھا۔ مگر خُدا اُن کی رُوح کو نہ شرمائے۔ اب وُہ اٹارنی جنرل ہو گئے ہیں۔

سردار عبدالرب نشتر نے ایک دن بتایا کہ ایک دفعہ پشاور کے ضلع میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ جس میں بڑے بڑے صاحبانِ ریش (ریشائیل) اور ملا بھی تھے۔ اور قائدِ اعظم کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ نشتر نے اُن کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ یہ ملا لوگ کسی کی بھی قیادت نہیں مانتے اور خصوصاً ایسوں کی جن کی ریش ہو نہ بروت مگر آپ کے سامنے اُن سب نے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ قائدِ اعظم نے جواب دیا، تم جانتے ہو کیوں؟ اِس لیے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کر رہا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ مل سکیں جو بے ریائی سے آپ کے لیے کام کریں۔ مگر اُن سے کام لینے کے لیے ایسا رہنما چاہیئے جو اولوالعزم ہو اور اِس لفظ میں قوتِ ارادی اِس قدر بھری

ہے کہ پیغمبروں میں بھی سب کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہیں قائد اعظم کے لیے کوئی دعویٰ پیغمبری نہیں کرتا اور نہ اولوالعزمی صرف پیغمبروں کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا کے کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتے اور جتنا بڑا ارادہ قائم کیا جائے اُتنا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قوتِ ارادی بہت حد تک ایک خداداد دولت ہے لیکن اس کا بڑھانا، اُس کا استعمال کرنا انسانوں سے تعلق رکھتا ہے مثلاً قائد اعظم اکیلے کیا کر سکتے تھے اگر آپ سب اُن کے پیچھے نہ ہوتے۔

اقبالؒ —— اقبال اور قائد اعظم کے ذکر سے اِس طرح میری حسرت تازہ ہو جاتی ہے کہ لوگ جائز طور پر سمجھتے ہیں کہ مجھے اُن دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہو گی مگر حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم کو صرف ایک فاصلہ سے دیکھا تھا اقبال کو تو دیکھا تک نہیں۔

سب سے پہلی چیز جس پر اقبال کی نظر پڑتی ہے وہ قرآن ہے۔ اُس کے نزدیک قرآن کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اِس بات کا شعور پیدا کرے کہ اس کے تعلقات خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔ اسلام میں حقیقت اور مجاز دو مخالف طاقتیں نہیں ہیں بلکہ مجاز کی دائمی کوشش یہی رہتی ہے کہ حقیقت پر روشنی ڈالے اور اُس کو اپنا حصہ بنالے۔ اور اسی لیے وہ حقیقت کی تلاش مجاز میں کرتا ہے۔ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے۔ پڑھنے والوں کے علاوہ سُننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیئے اور کچھ نہیں تو تیمم ہی سہی۔ ممکن ہے آپ کی تقدیر میں تیمم ہی لکھا ہو مسلمان جو ہوئے۔

حمید نظامی —— اقبال اور قائد اعظم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے

حمید نظامی یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا عالمِ حسرت ہے۔ مثلاً اپنے والد کی آخری بیماری میں جب مَیں تعطیلاتِ گرما کے بعد لاہور آرہا تھا۔ تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ دن اور ٹھہر جاؤں۔ مَیں نے عذر کیا کہ ہائی کورٹ کے کھلنے کے وقت چیف جسٹس کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کی وفات کے وقت مَیں اُن کے پاس موجود تھا۔ مگر یہ حسرت دل ہی میں رہی کہ اُن کی آخری خواہش میں نے پوری نہ کی۔ اِس طرح کی حسرت حمید نظامی کے متعلق ہے مگر وہ اُن کی حریّت خیال کی بنا پر ہے۔ جب ایک ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی آگے نہ بڑھے مگر حدّ اعتدال پر کھڑے ہو کر اُفقِ امکاں کے بے پایاں حدود دکھا سکے، جو نہ لیڈر بننا چاہے نہ ستائش کی تمنّا رکھتا ہو نہ صِلہ کی پرواہ، ہمارے درمیان سے اُٹھ جائے تو محفلِ ہستی سونی ہو جاتی ہے۔

جسٹس شبیر احمد —— پچھلے ہفتے مَیں لاہور میں تھا شام کے وقت اپنے باغ میں کام کر رہا تھا کہ سڑک پر کسی کے کراہنے کی آواز آئی مَیں نے اپنے جمعدار سے پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ ایک لڑکے کے پیٹ میں سخت درد ہوا تھا جس سے وہ بیہوش ہو گیا ہے۔ مَیں نے کہا کہ اُس کو گھر پہنچانا چاہیئے۔ اُس نے کہا گھر کا پتہ معلوم نہیں۔ لوگ گزرتے ہوتے ذرا ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر اُس کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مَیں نے دل میں کہا چلو ہسپتال ہی پہنچا دیں۔ مگر جوں جوں مَیں سڑک کے قریب ہوتا گیا میرے دل میں یہ وہم بڑھتا گیا کہ اگر اس لڑکے کو ہیضہ ہوا تو مجھے بھی بیماری لگنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ میرا اِرادہ کمزور ہو رہا تھا اُس میں خارجی عفونت پیدا ہو رہی تھی۔ اِس شش و پنج کی حالت میں مَیں موقع پر پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ ایک موٹر پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور لڑکے کو موٹر میں لٹا دیا گیا تھا۔ ایسے وقت کوئی پہنچے تو فرشتۂ رحمت کہلاتا ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ اب میری موٹر کی ضرورت نہیں رہی تو میں بھی موٹر بیچ کرنے پر تیار ہو گیا۔ زیادہ نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فرشتہ جسٹس شبیر احمد ہیں۔ انھوں نے بتایا۔ کہ ایک آدمی مل گیا ہے جو بیمار کا گھر جانتا ہے۔ جسٹس شبیر احمد نے اُن باتوں کا خیال نہیں کیا جو میرے ارادے کو کمزور کر رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا آپ مجھ سے بہت اونچے ہیں۔ خدا آپ کو جسٹس شبیر احمد خاں کر دے۔ ایک پٹھان کسی کو اس سے زیادہ اور کیا دعا دے سکتا ہے۔ وہ خان کے بغیر انسان کی شخصیت کو نامکمل سمجھتا ہے اور شخصیت کو مزید سنوارنا مقصود ہو تو ایک خان نام کے شروع میں لگا دیتا ہے۔ مثلاً جسٹس خان شبیر احمد خاں۔ مجھے امید ہے کہ میری دعا جلد قبول ہو جائے گی۔ خیر چھوڑیے اِس قصے کو جو بات میں واضح کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ میرا اصل بے وضو تھا یعنی میرے ارادے کی کمزوری اُس کی تکمیل میں حائل تھی۔ اور شبیر جیسے لوگ ہمیشہ باوضو رہتے ہیں۔

جسٹس رحمٰن ——— کتابوں کو دیکھتے ہوئے جس کتاب پر نظر پڑی اُس کا نام تھا ترجمان اسرار، جو اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جسٹس شیخ عبد الرحمٰن، جنھوں نے رحمٰن کا بندہ بننے سے پہلے یہ تین ہفت خواں سر کیے ہیں۔ یہاں آپ (تین اور ہفت کے تضاد سے پریشان نہ ہوں) وہ ہزار ہا سال سے میرے دوست ہیں مگر اُن سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی اشارۃً بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ اور سچ کہتا ہوں کہ اِس دوران میں میں نے اُن کے چہرے پر خوش اخلاقی کی لاتعداد مسکراہٹوں کے باوجود ایسا کوئی تبسم نہیں دیکھا جس میں اقبال کی جھلک ہوتی۔

مگر اسی کتاب سے (یعنی ترجمان اسرار سے) میں نے بہت کچھ سیکھا خصوصاً

جسٹس رحمان کے سرِآغاز سے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے مقدمے سے اور سب سے بڑی بات یہ سیکھی کہ خودی یہ نہیں کہ کتابیں نہ پڑھوں اور دوسروں کے علم سے بے بہرہ رہ کر اپنے ذاتی عرفان ہی میں مست رہوں۔ اوروں کی خودی سے اپنی خودی کا مقابلہ کرنا ضروری ہے ورنہ خودی نمرود کی خدائی بن جاتی ہے اور سرِآغاز میں جس خواب سے جسٹس رحمٰن نے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علامہ اقبال اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اتنے میں رحمٰن پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر پہنچنے سے وہ نہیں چوکتے اور نشست بھی اچھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علامہ اقبال نے خود اُن کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی۔ وہ حمید نظامی کو آیا۔ اُنھوں نے کچھ دن بعد جسٹس رحمٰن کو خط لکھا جس میں 'اسرارِ خودی' کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اِصرار تھا۔ حمید نظامی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ خواب کی تعبیر بنے ورنہ جسٹس رحمٰن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔ جسٹس رحمٰن کا یہ خواب اتنا غدار نہ تھا۔ مگر اُنھوں نے یہ غداری ضرور کی کہ اقبال سے عہد لے لیا کہ آئندہ کسی جج کے خواب میں نہ آئیں چنانچہ میں نے کبھی اُن کو خواب میں نہیں دیکھا۔

تیسرے رحمٰن وہ ہیں جنھوں نے اپنا عہدہ میرے سپرد کرنے کے باوجود اپنی رومانی شاعری میں سے ایک شعر بھی میرے لیے ترکے میں نہیں چھوڑا۔ حالانکہ لوگ اِس غلط فہمی میں مجھے ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے بلاتے ہیں۔ کہ میں نے اُن کا عہدہ سنبھالا ہے تو اُن کے اثاثے پر بھی قبضہ کر لیا ہوگا۔

ختم کرنے سے پیشتر ایک غلط فہمی دُور کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ پہلا موقع نہیں کہ میں سُن رہا ہوں۔ کہ جسٹس رحمٰن نے مجھے وراثتِ منصبی میں کچھ دیا ہے۔ اُردو

نظم و فارسی کے ترجمے اور علم و ادب سب وہ ساتھ لے گئے اور آج میں اعلان کرتا ہوں کہ اُنھوں نے میرے پاس سوائے ایک چاندی کے گُرز کے اور کچھ نہیں چھوڑا ہے اور وہ گُرز بھی نہ وہ اٹھا سکتے تھے اور نہ میں اٹھا سکتا ہوں۔ البتہ ایک مرثیہ اُنھوں نے چھوڑا اور وہ بھی میرے مرنے پر لکھا تھا۔ یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے جب ہم ولایت میں تھے۔ میں سُنا دیتا ہوں تاکہ آئندہ وہ کسی اور چیز کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔

سوچتا تھا کہ مر گیا رستم　　　آئی آواز مر گیا رستم

. . . .

جب کبھی یاد اُس کی آئیگی　　　اُس کی شوخی مجھے ستائیگی

"زندگی کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟"

زندگی کا کیا ہے؟ کچھ نہیں سوچا جب تک ہے تو اُس کی اہمیت بھی ہے جب نہ ہو گی تو اپنی اہمیت بھی ساتھ لے جائے گی۔ کچھ دن چراغ جلے گا۔ پھول چڑھائے جائیں گے۔ اِس کے بعد پھر وہی حسرتوں کی وادیاں اور ہزار نامرادیاں۔

I-ادب

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

خطبۂ یومِ اقبالؒ

۱۹۵۹ء

میں سوچ رہا تھا کہ یہ تقریر کیسے شروع کروں سوائے اس کے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ اور پھر کئی صدیاں چھوڑ کر اقبال اور قائداعظم پر نگاہ ٹھہرتی ہے اور پھر اس جلسے کے منتظمین میری تعریف کریں گے اور میں کسرِ نفسی کروں گا۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ اگر بات صرف ان حضرات کے اختیار کی ہوتی تو میں کب کا بزرگ بن گیا ہوتا اور بکری کا دودھ اور دہ کا غذی لیموں میری غذا ہوتے۔ لیکن بکری کا دودھ پی کر آپ بھینسے کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دُنیا کی سیاست پر اس وقت بھینسا حاوی ہے۔ اس لیے مجھے بھی کچھ دن بھینس کا دودھ پی لینے دیجئے۔ اپنے متعلق تعریف کا لفظ شاید میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ مجھے تعارف کہنا چاہیئے تھا کیونکہ جو حضرات مجھے یہاں لائے ہیں۔ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اس محفل کے ذریعے ادب سے مجھے متعارف کرائیں۔ اور ضمنی طور پر اہلِ ادب سے میرا تعارف بھی کرا دیں۔ اب چونکہ میری گستاخیاں مشہور ہو گئی ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادب کے میدان میں بھی مجھے بے ادبی پر اُکسائیں۔ بہر حال تعریف اور تعارف کے معاملے میں زیادہ اُلجھنا نہیں چاہیئے کیونکہ سُنا ہے کہ جب ایک نیک مسلمان سے کسی نے پوچھا آپ کی تعریف؟ تو اُس نے سادگی سے جواب دیا "بھائی! ہماری کیا تعریف ہو سکتی ہے تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔" غرض تعارف ایسا ہونا چاہیئے کہ لوگوں کو غلط فہمی

میں مبتلا کرسے۔ مثلاً میں اگر فارسی یا اردو ادب کا پروفیسر ہوتا تو آپ توقع رکھ سکتے تھے کہ اقبال کے متعلق کوئی ایسی بات کروں گا جو طالب علموں کے بھی سمجھ میں نہ آسکے۔ مگر یہ صاحبان جو مجھے یہاں لائے ہیں خود جانتے ہیں کہ میرا سرمایۂ ادب کس قدر محدود ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فارسی جاننے کے سبب اگر میں دو چار شعر فارسی کے پڑھ دوں تو یہی اس موقعہ کے لیے کافی ہوگا۔

حضرات! اسی لیے میں اپنا تعارف خود کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ میں اس دنیا میں نووارد ہوں۔ صرف پچاس ساٹھ برس ہوئے کہ یہاں آیا ہوں۔ (اگر آپ نے برناڈ شا کا کھیل BACK TO METHUSELAH پڑھا ہو تو آپ میرے نووارد ہونے پر متعجب نہیں ہوں گے) اور اس عرصے میں اقبال کے تین شعر بھی میں نے یاد کر لیے ہیں۔ اگر یاد رہا تو آپ کو سناؤں گا۔ اس وقت تو مجھے ایک سردار صاحب کے تین راگ یاد آ رہے ہیں۔ سردار جی کے دوستوں میں علم موسیقی سے اُن کی واقفیت کا بہت چرچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہ سردار جی کے راگ کتنے ہیں؟ جواب دیا کہ تین؛ ایک تو ہے مالکونس، ایک کوئی اور ہے اور تیسرے کا نام میں بھول گیا ہوں۔ کتنے اچھے لوگ تھے خود چلے گئے اور قصے چھوڑ گئے بلکہ بعض قصے پٹھانوں کے سپرد کر گئے۔ مگر اس ڈر سے کہ کہیں سردار جی کے تین راگوں کا قصہ یہاں نہ دُہرایا جائے۔ میں نے تینوں شعر نئے سرے سے یاد کر لیے ہیں۔ سناؤں گا بعد میں اگر یاد رہا اور وہ شعر بھی یاد رہے۔ مگر یہ یاد ہے کہ میں شروع ہی سے اقبال مجرم کر رہا ہوں۔ اور یہ جرم اقبال کی شاعری کے متعلق ہو تو بڑا جرم ہے اور اقبال جرم کرنے والا بھی ایک وزن دار ہو گا اس لیے یہی تعریف کی۔

اور یہ تین شعر بھی مجھے جس طرح ملے وہ بھی ایک حُسنِ اتفاق ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک کتابوں کی نمائش کے افتتاح کے موقعہ پر میں نے مذاقاً یہ کہا تھا کہ اگر کتابیں

کسی کو تحفتہً دی جائیں تو اُن کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی مذاق کے ذریعے اپنا مدعا پورا کر لے تو اُسے شاعری کے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ حسنِ طلب کے لیے شعر ضروری نہیں۔ مجھے سوال کا یہ طریقہ پسند ہے کہ مطلب بھی حاصل ہو جائے اور خودی بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے، وُہ خودی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے خودی جو خود کی تورنت ہے گھر میں رہتی ہے، اور شاید اسی لیے اس پردہ نشین کی حفاظت اور بھی ضروری ہے۔ القصہ نمائش میں کتابوں کو دیکھتے ہُوئے جس کتاب پر نظر پڑی اس کا نام تھا 'ترجمانِ اسرار' اور جو 'اسرارِ خودی' کا منظوم ترجمہ ہے اور جس کے مترجم ہیں ڈاکٹر جسٹس شیخ عبدِ رحمٰن، جنھوں نے رحمٰن کا بندہ بننے سے پہلے یہ تین ہفت خوان سَر کیے ہیں۔ یہاں آپ (تین اور ہفت کے تضاد سے پریشان نہ ہوں) وُہ ہزارہا سال سے میرے دوست ہیں مگر اُن سے مجھے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ چوری سے کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اشارۃً بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ اتنا بڑا کام کر رہے ہیں اور سچ کہتا ہُوں کہ اس دوران میں مَیں نے ان کے چہرے پر خوش اخلاقی کی لاتعداد مسکراہٹوں کے باوجود ایسا کوئی تبسم نہیں دیکھا جس میں اقبال کی جھلک ہوتی۔ ورنہ میں خُود اُن کے پاس جاتا اور اُن تین اشعار میں سے جو میں نے یاد کیے ہیں ایک آدھ مصرعہ پڑھ کر اُن کی علمیت میں اضافہ کرتا اور ان کو موقعہ دیتا کہ میرے متعلق بھی کچھ لکھیں۔ مگر ان صاحبان کو سوائے نطشے اور برگساں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ میں جا کر لارڈ سینکی نظر آنے لگتا ہے (لارڈ سینکی کا قصہ پھر سناؤں گا) خیر خدا ہر ایک کو اپنی نیت سے ٹکرائے۔ میں تو ترجمانِ اسرار کو دیکھ کر دم بخود ہو گیا بلکہ میری ساری خودی کافور ہو گئی۔ لیکن شاید وُہ کیفیت بھی میری خودی کا ایک مظاہرہ تھی کیونکہ اسی کتاب میں مَیں نے پڑھا کہ جب خُودی عشق و محبّت سے مضبُوط ہوتی ہے تو نظامِ عالم کی ظاہر اور پوشیدہ قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ چُنانچہ

میں نے اس کتاب کے عشق و محبت میں اپنی خودی کو اس درجہ استوار کیا کہ مکتبہ کارل کے منتظمین مسخر ہو کر وہ کتاب مجھے تحفتہً دینے پر مجبور ہو گئے اور میں اس خیال سے کہ اُن کی خودی کو ٹھیس نہ لگے کتاب لینے پر مجبور ہو گیا۔

اب اگر آپ کو خودی کے کچھ پہلو نظر آنے لگے ہوں تو میں آگے چلوں۔ میری کمزوری یہ ہے کہ اگر کتاب میں کچھ پڑھ لیتا ہوں تو اُسے سچے مسلمان کی طرح صحیح مان لیتا ہوں۔ میں نے اقبال کی ایک نظم کرم کتابی پڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتابیں پڑھنا ہی چھوڑ دیں۔ کرم کتابی اُس کیڑے کو کہتے ہیں جو کتابوں میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے اوراق کو چاٹ جاتا ہے۔ استعارے میں اُس پڑھنے والے کو بھی کرم کتابی کہتے ہیں جو کتابیں ہی پڑھتا رہے اور زندگی کی حرارت سے اور دنیا کے سوز و ساز سے ناآشنا رہے۔ پانچ شعر کی نظم ہے آپ بھی سُن لیجئے:۔

شنیدم شبے در کتب خانۂ من

بہ پروانہ می گفت کرم کتابی

ایک رات میری لائبریری میں ایک کتابوں کا کیڑا پروانے سے شکایت کر رہا تھا۔

بہ اوراقِ سینا نشیمن گرفتم

ہمہ تیرہ روزم زبے آفتابی

مگر زندگی کی حقیقت کچھ سمجھ میں نہ آئی اور تاریکی بدستور قائم رہی۔ پروانے نے کیا اچھا جواب دیا۔

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے

کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی

کہ یہ نکتہ تجھے کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔ کیا نکتہ؟

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را

زندگی جس چیز سے زندہ رہتی ہے وُہ تپش ہے، گرمی ہے، محبت ہے، حس ہے۔ زندگی کی مشکلوں سے لڑنا ہے اور یہ باتیں کتابوں کے پڑھنے سے نہیں آتیں۔ پروانے کی یہ نصیحت سُن کر مَیں نے بھی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔ مگر اس کتاب سے (یعنی ترجمانِ اسرار سے) مَیں نے بہت کچھ سیکھا۔ خصوصاً جسٹس رحمٰن کے سرِآغاز سے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے مقدمے سے اور سب سے بڑی بات یہ سیکھی کہ خودی یہ نہیں ہے کہ کتابیں نہ پڑھوں اور دوسروں کے علم سے بے بہرہ رہ کر اپنے ذاتی عرفان ہی میں مست رہوں اَوروں کی خودی سے اپنی خودی کا مقابلہ کرنا ضروری ہے ورنہ خودی نمرود کی خدائی بن جاتی ہے اور سرِآغاز میں جس خواب سے جسٹس رحمٰن نے آغاز کیا ہے اس نے تو مجھے بے خُود کر دیا۔ خواب یہ تھا کہ علاّمہ اقبال اپنے بے تکلفانہ انداز سے محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ احباب جمع ہیں کہ اتنے میں جسٹس رحمٰن پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پہ پہنچنے سے وہ نہیں چُوکتے اور نشست بھی اچّھی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تو علاّمہ اقبال نے خود اُن کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ خواب کے بعد خیال کی باری تھی۔ وُہ حمید نظامی کو آیا۔ اُنھوں نے کچھ دن بعد جسٹس رحمٰن کو خط لکھا جس میں اسرارِ خودی کے منظوم ترجمے کی ضرورت پر اصرار تھا۔ حمید نظامی کی اس خدمت کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ وُہ خواب کی تعبیر بنے۔ ورنہ جسٹس رحمٰن اب تک خواب ہی دیکھا کرتے۔

میں نے سوچا شاید میں بھی کوئی خواب دیکھوں مگر نہیں دیکھا۔ میں خواب دیکھتا بھی ہوں تو اور چیزوں کے۔ بہت سال ہُوئے جب ہندوستان میں جنگِ آزادی جاری تھی تو کسی نے تقریر کرتے ہُوئے کہا کہ مَیں نے خواب دیکھا ہے کہ آزادی آ رہی ہے گھوڑے پر سوار۔ یاد نہیں کہ اس نے گھوڑے کہا تھا یا بھیڑیا۔ بعد میں بھیڑیے بھی کافی

تعداد میں آئے۔ بہرحال خواب دیکھا کہ آزادی آرہی ہے اور انگریز اپنے بستر گول کر رہے ہیں۔ اس تقریر کے نتیجے میں پولیس نے اس پر مقدمہ چلایا کہ یہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلاتا ہے۔ مجسٹریٹ نے قید کی سزا دی۔ میں نے بطور سیشن جج اپیل سُنی۔ بستر گول کرنے پر مجھے ہنسی آئی۔ مجھے ہنسی بھی آتی ہے مگر زیادہ تر رونا آتا ہے۔ میں نے کہا کیا کسی کو یہ بھی اجازت نہیں کہ آزادی کے خواب ہی دیکھ سکے۔ غرض میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ خوابوں کا مجھ پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اسی لیے میں کچہری میں آدھا وقت سوچتا رہتا ہوں۔ جسٹس رحمٰن کا یہ خواب اتنا غدارانہ نہ تھا مگر انھوں نے یہ غداری ضرور کی کہ اقبال سے وعدہ لے لیا کہ آئندہ کسی جج کے خواب میں نہ آئیں۔ چنانچہ میں نے کبھی خواب نہیں دیکھا۔ اس وقت مجھے فیضی کا قصہ یاد آرہا ہے جو بے محل ہونے کے باوجود سُنائے دیتا ہوں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔ اگر آپ نے کسی اور طرح سے سنا ہو تو وُہ بھی ٹھیک ہے۔ فیضی نے سُنا تھا کہ جب سعدی نے یہ شعر کہا ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

سبز درختوں کا ہر پتا خُدا کی معرفت کا دفتر ہے۔ جب سعدی نے یہ شعر کہا تو آسمان سے فرشتے اس کے لیے خلعت لے کر اُترے۔ یہ تو یاد نہیں کہ ایک فرشتہ تھا یا دو۔ عموماً دو دو پھرتے ہیں۔ اور یہ بھی یاد نہیں کہ اُنھوں نے پَر لگائے تھے یا حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کی طرح بازوؤں کے بغیر تھے۔ مگر شعر معرفت کا تھا اور وُہ خلعت لانے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے آپ کو یاد ہوگا کہ فرشتے ایسے موقعوں پر ہمیشہ مخالفت کرتے رہے ہیں۔ اور خُدا سے یہی کہتے رہے ہیں کہ یہ لوگ دُنیا میں فساد کرتے ہیں اور خلافت تو ایک طرف کسی آئین پر بھی نہیں چل سکتے۔ اور "بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" ایک کا ایک دُشمن ہے اور "فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ" ان کے گھر بھی ہیں اور گلمرگ میں بڑے بڑے بنگلے ہیں جو بنا کر

بیچتے رہتے ہیں اور وہ بھی نفع پر خصوصاً کراچی میں (یہ کراچی کا ذکر قرآن میں نہیں ہے میں اپنی طرف سے کہتا ہوں۔ مگر خاکم بدہن بعض باتوں کا خدا نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔) اچھا 'فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ' مکان تو ہیں 'مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ' وہ ٹھہرتے تھوڑے وقت کے لیے ہیں۔ یہ تقسیم ہند کے فوراً بعد کے واقعات ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔

صاحبان! میں بے ربط باتوں کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں فیضی کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس نے سُنا تھا کہ فرشتے سعدی کے ایک شعر کے صلے میں خلعت لائے تھے اس نے بھی شعر کہا: ؎

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

گھاس کا ہر سرا جو زمین سے نکلتا ہے خدا کے ایک ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ شعر کہہ کر وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جھوم جھوم کر شعر پڑھا اور فرشتوں کا انتظار کرتا رہا فرشتہ تو کوئی نہ آیا۔ ایک پرندہ اُدھر سے گزرا، آخر وہ بھی پَروالی مخلوق ہے! پرندہ زیادہ نزدیک تو نہ آیا اُوپر سے پیغام دے کر چلا گیا۔ پیغام بیٹ کی صُورت میں تھا جو فیضی کی ڈاڑھی پر گری۔ فیضی نے آہ سرد کھینچی اور حسرت سے کہا "قدردانیِ عالمِ بالا معلوم شُد" میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اس قصّے کو سچ سمجھیں۔ ممکن ہے یہ قصہ فیضی کے کسی مخالف نے گھڑا ہو کیونکہ مخالفین اکثر ایسی باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب میں نے نہ خواب دیکھا نہ خلعت کا اعزاز پایا۔ نہ فیضی کی طرح اپنے آپ کو کسی خلعت کا مستحق سمجھا تو پھر کس حیثیت سے اس پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ نہیں حضرات یہ مجھے پسند نہیں کہ آپ کسی کو محض اُس کے عہدے کے لحاظ سے یہاں کھڑا کر دیں۔ یہ ہم دونوں کی خودی کے منافی ہے۔ آپ اُس چیز کی قدر کریں جو کسی کو یہاں خطاب کرنے کا اہل بناتی ہے۔ ایک رسالے کے مُدیر

نے ایک بار مجھ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس نے لکھا کہ وہ مختلف مسائل کے متعلق میرے خیالات معلوم کرکے اپنے رسالے میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ مَیں نے اُسے لکھا کہ تھوڑے عرصے تک مَیں اپنی میعادِ ملازمت ختم کرکے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر گلابوں میں پیوند لگایا کروں گا۔ اگر اُس وقت بھی مُدیر صاحب مجھے اس قابل سمجھیں کہ دنیا کے اہم مسائل کے متعلق میری رائے پُوچھیں تو مجھے لطف آئے گا۔ اِس وقت تو میری رائے سرکاری ہوگی۔ مُدیر صاحب نے پھر نہیں پوچھا اور نہ پھر گاؤں میں پُوچھیں گے۔ مگر میں آپ سے پُوچھتا ہوں کہ کیا عُہدے کے اعزاز کے بغیر کوئی انسان نہیں رہتا؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس پلیٹ فارم کا درجہ اتنا بڑھائیں کہ چیف جسٹس خود اِس کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں اور شاید کسی ایسے ہی مقام پر اقبال نے کہا ہوگا۔ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کہنے کو تو اچھی بات ہے مگر خودی کو بلند کیسے کریں اور کیا خدا بندے سے سچ مُچ اِس طرح کا سوال کرتا ہے۔ اقبال میں یہی تو خوبی ہے کہ اُس کی بات سُن کر آپ ناممکن کو بھی ممکن سمجھنے لگتے ہیں۔ دل خوش ہوتا ہے، اپنی ہستی پر اعتبار آنے لگتا ہے ہم توانا ہیں، ہم اولوالعزم ہیں، ہم ارادے کے مالک ہیں کیوں خُدا سے سوال کریں۔ خدا خود ہم سے پُوچھے گا۔ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی نے یہ اعلان کے طور پر کہا کہ اب ہر کام میری مرضی کے مطابق ہوتا ہے اور تشریح یُوں کی کہ میں کوئی خواہش ہی نہیں کرتا، اپنا کام کیے جاتا ہوں اور جب کچُھ ہوتا ہے تو سمجھتا ہوں یہی ٹھیک ہے، جو اللہ کی مرضی وُہ میری مرضی، یہ ہُوا ایک مطلب۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اَلسّعیُ مِنّی وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللہِ، یعنی کوشش تو میری ہوگی اور اس کی تکمیل خدا

کے ہاتھ میں ہے بلکہ اقبال تو کہتا ہے کہ کوشش تو وہی اچھی ہے جو جاری رہے اور ختم ہی نہ ہو۔ سہ

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اس کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ جو کام آپ کے سپرد ہوا ہے اُسے آہستہ آہستہ قسطوں میں کرتے رہیں تاکہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ یہی بات فارسی میں یُوں ادا کی ہے۔ سہ

بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

دریا کی لہروں سے لڑو۔ اصل زندگی جدوجہد میں ہے۔ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہو۔ اُنھیں حل کرنے کی کوشش کرو۔ ہر بات اِس طرح سے زمان لیا کرو جیسے سُورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں ڈوبتا ہے۔ زندگی میں بہت سکون ہو، تو ساکت ہونے لگتی ہے۔ حرکت ہی زندگی کی نشانی ہے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے، کھڑی ہو تو لو ہے اور لکڑی کے ڈبے ہیں۔

ساحل اُفتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم

ساحل ایک جگہ پر پڑا ہے کہتا ہے کہ اتنی زندگی گذری مگر معلوم نہ ہو سکا کہ میں کون ہُوں۔ موج ساحل سے ٹکرا کر بولی۔ دیکھا میں ٹکراتی تو موج کہلاتی۔ اگر ساکت رہتی تو معدوم ہوتی۔

میرے بھائیو! تم بھی موج کی طرح خروش کرو۔ خروش نہیں تو خرام ہی کرو جنبش میں آجاؤ نگریاں کچھ کچھ جنبش تو اب نظر آرہی ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک شوریدہ سر شاعر نے، جو ریلوے میں مُلازم بھی تھا، بڑے درد سے کچھ شعر کہے جن میں ایک یہ بھی تھا: ؎

دیکھتا کیا ہے میرے مُنہ کی طرف
قائدِ اعظم کا پاکستان دیکھ

مَیں اُن دنوں حکومت کا قانونی مُشیر تھا۔ وہ مجموعۂ اشعار میرے پاس آیا کہ بتاؤ۔ اس پر کون سی دفعہ لگتی ہے۔ میں نے کہا کہ خُدا کے بندو! وُہ تو صرف یہی کہتا ہے کہ میرے مُنہ کی طرف کیا دیکھتے ہو، پاکستان کی طرف دیکھو کیا یہ وُہی ملک ہے جو قائدِ اعظم نے تراشا تھا۔ اگر آپ اس کے مُنہ کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں تو خوشی سے دیکھیں۔ مجھ سے راستے چلنے والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں تھے تو اُس خودی کو جو قوم میں پیدا ہو گئی تھی انھوں نے ترقی دی اور نہ سمندر کی موجوں سے نبرد آزما ہُوئے۔ آخر مارشل لاء آیا بلکہ دوسری دفعہ آیا۔ ایک طرف تو لوگ خوش ہُوئے کہ ایسی باتوں پر جو عام زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اچھا اثر ہوا، دوسری طرف اس کے خروش سے گھبرانے بھی لگے۔ اس لیے حکومت نے کچھ آپ کے کہنے سے، کچھ میرے کہنے سے، کچھ خود سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ نظامِ حکومت کے عام شعبوں میں جس قدر ہیجان کم ہو گا عوام میں اُسی قدر زیادہ اعتماد پیدا ہو گا۔ جب یہ ہوا تو بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ تو مارشل لاء نہ ہوا مذاق ہوا۔ خروشیدن سے اُتر کر خرامیدن کی گردان رگوں کو پھر سست کر رہی ہے۔ چنانچہ تین چار دن ہُوئے کسی نے مجھ سے کہا کہ رشوت اب پھر زوروں پر ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے کیا آپ میں خودی کا ارتقا کبھی نہیں ہو گا؟ کیا آپ سے یہ نہ ہو سکے گا کہ اپنے اخلاق کو حکومت کی مدد کے بغیر ٹھیک رکھیں

مَیں تو سوچ سوچ کے تھک گیا ہُوں اور سوائے اس کے چارہ نہیں دیکھتا کہ پیامِ مشرق پڑھوں۔ میں یہ بتانا بھُول گیا تھا کہ ان تین اشعار کے علاوہ جن کا مَیں نے آپ سے وعدہ کیا تھا مَیں نے 'پیامِ مشرق' بھی پڑھا ہے۔ وُہ تین شعر تو مَیں بیان کر چکا ہُوں۔ شاید آپ نے خیال نہ کیا ہو۔ ایک تو یہ کہ خُودی پیدا کرو اور خُودی سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کوشش ناتمام سے زندگی کی بقا ہے اور تیسرے یہ کہ زندگی کی مشکلات سے مری یا ایبٹ آباد یا ولایت کی طرف نہ بھاگو۔ میں آپ کو کسی خاص امتحان میں مبتلا نہیں کر رہا ہُوں آپ میں سے ہر ایک کے لیے یہ ممکن ہے کہ اُن پہ عمل کر کے پہلے اپنی ذات کو، پھر قوم کو فائدہ پہنچائے۔ مختصر یہ کہ جہاں جہاں آپ ہیں کوشش سے، محنت سے اور دیانت داری سے ترقی کر سکتے ہیں۔ ایک ایک قطرہ مل کے دریا بن جاتا ہے جس سے پورا ملک سیراب ہو سکتا ہے اور باہر سے پانی لانے کی ضرُورت باقی نہیں رہتی۔

صاحبان! میں پھر بے ربطی کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے 'پیامِ مشرق' پڑھی ہے مگر اس کتاب کو مؤنث باندھنا دل نے گوارا نہ کیا کیونکہ پیغام نہایت مردانہ ہے (اس بات پر کہیں خواتین مجھ سے بدظن نہ ہو جائیں) حقیقت یہ ہے کہ اس تذکیر و تانیث کے جھگڑے میں اکثر مبتلا رہتا ہوں۔ کتابوں کی نمائش میں جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہُوں ایک اردو ڈکشنری نظر سے گزری۔ مَیں نے کھول کر دیکھی تو پی ڈبلیو ڈی کا لفظ سامنے آیا۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ پی ڈبلیو ڈی سے مراد ہے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی تعمیر و تخریب کا محکمہ۔ ریکٹوں میں لکھا تھا (مؤنث)، یعنی پی ڈبلیو ڈی کا لفظ مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا چلو خیر ہُوئی کہ یہ محکمہ ابھی مؤنث ہے۔ اگر مذکر ہوتا تو یہ لوگ نہ جانے کیا کر گزُرتے۔ ہاں تو ذکر تھا 'پیامِ مشرق' کا۔ اس کتاب کے مطالعے سے خیر و شر اور قضا و قدر کے بُہت

سے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ اردو میں تو اقبال نے یہ کہا تھا کہ کبھی کبھی خدا بندے سے خود پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔ لیکن پیامِ مشرق پڑھنے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو بھی خدا سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے یہ کس طرح کی دُنیا بنائی ہے تو نے؟ ؎

صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنا ساختی

ہمارے خیال کی کھیتی سے تو سینکڑوں عالم وجود میں آتے ہیں تو نے تو ایک دنیا بنائی ہے اور وہ بھی آرزوؤں کے خون سے۔ ع

ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

مگر ان اشعار کا لطف آپ کو تب آئے گا۔ اگر آپ تھوڑی بہت فارسی جانتے ہوں یا کوئی ایسا نمایاں کام کیا ہو جس کے سبب شیطان کے ہم مشرب قرار پائیں۔ شیطان کو پہلی دفعہ ملٹن نے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے جرم کا مرتکب ہوا تھا، آخر بڑی شخصیت رکھتا ہوگا جو خدا سے یہ کہہ سکا کہ آدمی کو تو نے مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے۔ ؎

نوری نادان نیم سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم

میں کوئی نادان فرشتہ ہوں کہ آدم کو سجدہ کروں۔ شیطان کی اس جرأت پر دل میں عزت پیدا ہوتی ہے اور اقبال تو ہمدردی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر قرآن سے یہ معلوم نہ ہوتا کہ آدمی کا کیا تصور تھا اور شیطان نے کیا نافرمانی کی تھی تو اقبال کو پڑھ کر تو میں یہ سمجھتا کہ دونوں بیچاروں پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہماری تقصیر صرف یہ تھی کہ گندم کا دانہ کھایا اور اس کی خطا یہ کہ اس نے آدم کو سجدہ نہ کیا اور خدا اب دونوں سے

ناخوش ہے۔ سہ

جُرمِ ما از دانۂ تقصیر او از سجدہ
نے بآں بیچارہ می سازی نہ باما ساختی

مگر سچ پُوچھئے تو فتنے کا باعث گندم کا دانہ ہے اور ہم اب بھی گندم کو نہیں چھوڑتے بلکہ اس فکر میں لگے ہیں کہ کس طرح کھاد کے استعمال سے اس کی پیداوار بڑھائیں۔ البتہ بنگال والے تو اُس دن سے ایسے ڈرے ہیں کہ اگر قحط سالی بھی ہو تو چاول ہی مانگتے ہیں اور سُنا ہے کہ بعض اوقات تو موت کو گندم پر ترجیح دیتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جو اختلاف مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہے وُہ دراصل زبان کا نہیں چاول کا ہے اور چاول بہشت میں نہیں ملتے۔ مگر اب تو نہ چاولوں کا جھگڑا ہے نہ زبان کا اختلاف، نہ اِس بات کا کہ کراچی مرکز کے نیچے ہو یا مرکز کے اُوپر، نہ اِس بات کا کہ ایک یونٹ اچھا ہے یا چار۔ آپ لڑتے بھی ہیں تو کن باتوں پر۔ مگر اب تو سہ

اقبال تیرے عشق نے سب بل دیئے نکال

نوٹ: سامعین کے قہقہوں اور تالیوں کی وجہ سے دوسرا مصرعہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔

ساڈے خواباں وچ آیا کرو

بزمِ اقبالؒ

(لائلپور- اپریل ۱۹۶۱ء)

صاحبِ صدر!

یومِ اقبال سے بہت دن پہلے آپ کے سیکرٹری نے مجھے بذریعہ خط دعوت دی کہ اگر میں کانووکیشن ایڈریس کے لیے لائلپور آرہا ہوں تو اس کے بعد اُسی شام کو مجلسِ اقبال میں تقریر کروں اور گیارہ بجے رات فارغ ہو کر واپس لاہور بھی چلا جاؤں اور صبح ہائیکورٹ میں مقدموں کے فیصلے بھی کروں۔ یہ آخری بات تو غالباً انھوں نے مجھ پر چھوڑ دی تھی مگر میں اُن کا مطلب سمجھ گیا۔ وُہ جانتے تھے (آخر اُنھوں نے میری تصویر تو دیکھی ہوگی) کہ اتنی کارگزاری کے بعد میں واپس جانے کے قابل تو کیا، یہاں رہنے کے قابل بھی نہیں رہوں گا اور وہ میری یادگار کہیں نہ کہیں بنا دیں گے۔ آجکل یادگاروں کے دن ہیں۔ سُنا ہے اب پاکستان کی یادگار بننے کو ہے، جیسے آپ خودکم یادگار ہوں۔ جیسے آپ کی کاروباری دیانت داری بجائے خود ایک یادگار نہ ہو۔ مگر سنا ہے کہ آپ مجسّموں سے گھبراتے ہیں کیونکہ بُت پرستی دینِ احمدؐ میں کہیں نہیں آئی۔ جہاں بُت دیکھا آپ نے توڑ دیا خواہ لارنس جیسے نیک دِل شخص کا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تو اچھا ہُوا کہ آپ نے یہ مصرعہ نہیں پڑھا۔ ع

اس لیے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

ورنہ تصویروں کا کیا حال ہوتا۔ اب تو آپ اخباروں اور رسالوں کو تصویروں سے زینت دے سکتے ہیں اور خوب دیتے ہیں حالانکہ یہ بدعت ہے۔ آپ میں سے جو لوگ زیادہ دیندار ہیں وہ تصویر میں شکل کو ذرا ٹیڑھا کر دیتے ہیں یعنی بگاڑ دیتے ہیں تاکہ نقلِ کفر نہ ہو جائے مثلاً سر کو غبارے کی طرح بناتے ہیں اور ٹانگوں کی بجائے لکڑی کے ڈنڈے لگاتے ہیں۔ اس کو کارٹون کہتے ہیں۔ ایک دفعہ میرے ساتھ بھی کسی رسالے نے یہ سلوک کیا تھا۔ کارٹون دیکھ کر جب ایک خاتون نے مجھے خط لکھا تو میں نے بہت جلد ، دیگر ضروری کام چھوڑ کر، اُن کو جواب دیا کہ میں دیکھنے میں اتنا بُرا نہیں ہُوں مگر تصویر کی کیا بات ہے۔ ایک خاتون نے تصویر نہیں دیکھی تھی۔ انھوں نے جب مجھے دیکھا تو بے ساختہ کہا کہ آپ کی تقریروں سے جو تاثر قائم کیا تھا وہ کچھ اور تھا۔ میں نے کہا مجھے دیکھ کر لوگوں کو مایوسی ہوتی ہے مگر حسن تو آپ کے لیے ہے۔ میرے لیے آپ کا حسنِ ظن کافی ہے۔ مگر میں مجسموں کا ذکر کر رہا تھا اور یہ کہ بُت پرستی حرام ہے اور بُت شکنی حلال۔ البتہ اتنی فراخ دلی ہم میں ضرور ہے کہ یہ حلال و حرام کا سلسلہ صرف پتھر کے بُتوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ باقی ہمارے بُت بھی ہیں اور بُت خانے بھی اور اُن کی پُوجا پر ابھی تک کسی اہلِ شرع نے اعتراض نہیں کیا بشرطیکہ اُس پر اللہ کا نام پڑھ لیا جائے۔ ع

سچ کہہ دُوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے

ایک دفعہ میرے ایک دوست کے پاس کوئی ٹھیکیدار پھل کا ایک ٹوکرا لایا میرے دوست میں یہ کمزوری تھی کہ کسی کی دِل شکنی نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ کہتے تھے کہ مسلمان کے لیے یہی کافی ہے کہ بُت شکن ہو، دل شکن کیوں بنے۔ مگر ساتھ ہی مجھ سے پُوچھا "یہ حرام تو نہیں ہے۔ ٹھیکہ تو مجھے کسی کو دینا ہی تھا۔ اتفاق سے اسی کو دے دیا۔ اور اس کے علاوہ میں نے مسئلہ سُنا ہے کہ کسی چیز پر شک ہو تو اس

پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔" میں نے کہا "وہ ٹھیکیدار تو اسے خدا کے نام پر نہیں لایا تھا تمھارے نام پر لایا تھا۔ ایسی مشکوک چیزیں خود کھایا کرو۔ اللہ کے نام پر کسی غریب دوست کو دے دیا کرو۔" اس وقت میں اُن کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔

القصہ سیکرٹری صاحب کو میں نے لکھا کہ میں تو ماہِ مئی میں آؤں گا اور اقبال پر مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ دو سال پہلے کہہ چکا ہوں۔ اس خط پر لاٹل پور میں سکوت طاری ہو گیا اور میں آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر آنے سے دو دن پہلے صاحبِ صدر نے بھی اللہ کا نام لے کر ایک تیر پھینکا جس سے میں بال بال بچ گیا۔ میں نے اُن کو لکھا کہ آپ نے اتنی دیر سے تیر پھینکا ہے کہ طبیعت میں جولانی تو آ نہیں سکتی، البتہ جنبش سی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ لکھا انھوں نے یہ تھا کہ آپ نے دو سال پہلے جو باتیں اقبال کے متعلق کی تھیں وہ تو لوگ بھول گئے ہوں گے۔ لوگوں کا حافظہ دو سال تک کہاں رہ سکتا ہے، آپ وہی پرانی باتیں نئی سمجھ کر سنا دیجئے۔ اس لیے اے دوستو اور بہنو! میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ بُرا نہ مانو اور اقبال کے لیے کوئی نیا شوالہ بناؤ کیونکہ

تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

اور یہ جو آپ کے حافظے کے متعلق صاحبِ صدر نے رائے دی ہے، میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ کو اُن کے خلاف بھڑکاؤں، مگر یہ اُن لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے جن کا حافظہ بوسیدہ ہو، یعنی اس میں بھوسہ بھرا ہو، اور جو پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں جیسے کسی ظالم یا نا اہل کے عہدِ حکومت میں آپ دُعا کریں کہ الٰہی اس مرتبہ تو ہمیں معاف کرو۔ آئندہ کبھی اس کو ووٹ نہیں دیں گے۔ پھر پانچ سال تو کیا، دو سال بعد جب نئے انتخابات ہوتے ہیں، بشرطیکہ درمیانی عرصے میں وہ کم از کم ایک سال حکومت کے مخالف گروہ میں رہا ہو، تو وہ آپ کے سامنے مظلوم

چہرہ لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تو صرف دس پھانسی کے مجرموں کو اپنے ووٹروں کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ میرے بعد ایک سال میں پچیس آدمی چھوڑے گئے اور یہ اُن کے علاوہ تھے جو پاکستان ڈے اور یومِ جمہوریہ اور یومِ نسواں پر چھوڑے گئے۔ یومِ نسواں کا ٹھیک علم نہیں کہ منایا جاتا ہے یا نہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بھی یومِ نسواں نہ ہو اور اگر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُس کی خوشی میں قید سے لوگ آزاد نہ کیے جائیں۔ میں پُوچھتا ہوں، چلئے پھر سہی، اب مجھے جلدی ہے۔

مَیں نے لاہور میں کہا تھا کہ اقبالؔ کے میں نے تین شعر یاد کیے ہیں اور اگر یاد رہا تو سُنا بھی دُوں گا۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو وُہ تین شعر بھی یاد نہیں رہے۔ مگر کسی نے یاد دلایا کہ لاہور میں مَیں نے صرف ایک ہی مصرعہ پڑھا تھا۔ دُوسرا مصرعہ پڑھنے کا موقعہ آج آیا ہے۔ بات یُوں ہوئی کہ مَیں اپنے سامعین سے کہہ رہا تھا کہ آپ نے ملک میں ہر قسم کے معاملے کھڑے کر دیئے ہیں۔ کبھی یہ کہ چاول بنگال میں کیوں زیادہ ہوتے ہیں، کبھی یہ کہ لیچی یہاں کیوں نہیں ہوتی، کبھی یہ کہ ہماری قومی زبان ایک کیوں نہ ہو اور ایک بھی وُہ جسے ہم بولتے ہیں مگر اب تو یہ عالم ہے کہ

اقبالؔ تیرے عشق نے سب بَل دیئے نکال

بس اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ لوگ اختیار کی باگ اپنے پھیپھڑوں کے سپرد کر کے ہنسنے لگے اور مجھے موقعہ ہی نہیں دیا کہ دوسرا مصرعہ پڑھوں اور میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اُس کے بعد کسی نے نہیں پُوچھا کہ وُہ دوسرا مصرعہ کیا ہے۔ مجھے اُس دن معلوم ہوّا کہ لاہور کے لوگ کتنے ہوشیار ہیں۔ وُہ فوراً سمجھ گئے کہ میں دوسرا مصرعہ پڑھنے والا ہوں۔ مگر چُونکہ آپ لاہور کی ہوشیاری سے ۷۰ میل اِدھر ہیں، مَیں بتائے دیتا ہوں

ع مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

یہ سوال تو مجھے لاہور میں کرنا چاہیئے تھا لیکن چونکہ وہاں موقعہ نہیں ملتا اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپ ہی سے پوچھ لوں۔ اب جو میں پوچھنے لگا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین سوال سامنے آ گئے ہیں اور سوال یہ ہے کہ کون سا سوال پہلے کروں۔ کیا پہلے یہ پوچھوں کہ سچ مچ آپ کے بل سب کے سب نکل گئے ہیں یا یونہی بہانہ کرتے ہیں۔ اے برہمنو! اگر بُرا نہ مانو تو مجھے آپ پر شک ہے کیونکہ جن مورتوں کی آپ پرستش کرتے ہیں وہ تو پتھر کی طرح سخت ہیں اُن کے بل کیسے نکل سکتے ہیں اور اسی مناسبت سے آپ کے نظریئے بھی سخت ہیں یعنی ٹھوس اور جامد قسم کے جن میں لچک نہیں ہوتی اور ان کے بل نکلیں تو وہ ٹوٹ جاتے ہیں بدل نہیں سکتے۔ اگر آپ اپنے نظریوں میں بحث اور اصلاح کی گنجائش رکھیں تو کیا مضائقہ ہے ویسے پتھر بھی تو تراشے جاتے ہیں۔

یا پہلے یہ پوچھوں کہ اگر بل نکلے ہیں تو کیا اس نرم جذبے کے تحت جو محبّت سے پیدا ہوتا ہے یا خوف وہراس کی مجبوری سے۔ میرے ایک درباری کالر میں دھوبی نے بہت نشاستہ لگا دیا تھا، جسے اس کی برادری میں کلف کہا جاتا ہے درباری کالر سے میری مُراد وہ سخت کالر ہے جو ہمیں جون کے مہینے میں بھی پہننا پڑتا ہے تاکہ گردن سیدھی رہے۔ ایک دن مجھے زیادہ تکلیف ہونے لگی تو کالر اتار کے پانی میں بھگو دیا۔ آخر گردن کب تک سیدھی رکھی جاسکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ اور سب کچھ ٹیڑھا ہو، جیسے عمر خیام نے کہا تھا کہ "صد کار کنی کہ گردن زدنی است" یعنی سو کام ایسے کرتے ہو جن کے سبب تمھاری گردن اُڑا دینی جائز ہے۔ اُس نے شاید کچھ اور کہا تھا جو مے کی غلامی کے سلسلے میں تھا۔

صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

مگر بعض شعر لوگوں نے بدل دیے ہیں کیونکہ مے کچھ ایسی بُری چیز نہیں رہی بشرطیکہ دلیسی نہ ہو اور کلب میں پی جاتے۔ الغرض وہ کالرینی کے زیرِ اثر بالکل نرم ہو گیا اور میں نے کہا یہ کالر کتنا ہمدرد ہے مگر جب اس کو دوبارہ ہوا لگی تو سُوکھ کر پھر اکڑ گیا جب میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ کے بَل شاید خوف و ہراس کی مجبوری سے نکلے ہوں تو مجھے وُہ کالر یاد آتا ہے جو پانی سے نرم ہو گیا تھا مگر جب مجبوری خود کسی مجبُوری سے چلی گئی تو اُس کی اکڑ پھر اکڑ کر واپس آگئی۔

یا پہلے یہ پُوچھوں کہ آپ کی وُہ آرزو نکلی یا نہیں کہ کوئی آپ کو سیدھا کرے مگر اس پر میں نے سوچا کہ انسان پر خُود بینی کا الزام یُوں ہی لگایا جاتا ہے۔ زیادہ تر تو وُہ غیر بین ہوتا ہے مثلاً ہر ایک ہم میں سے یہی کہتا ہے کہ ضرورت ہے کہ کوئی ان لوگوں کو سیدھا کرے اور وُہ خود کو ان لوگوں میں سے نہیں سمجھتا۔ ایک اقبال ہی نے مان لیا کہ اُسے خُود سیدھا ہونے کی ضرورت تھی۔ مگر اقبال کتنا سیدھا آدمی ہے جہاں کسی جرُم کے عائد ہونے کا احتمال ہو تو وُہ خود اقبال کر لیتا ہے تاکہ استغاثے کو جھُوٹی شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مثلاً ہر موقعہ پر وُہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ صرف باتیں کافی نہیں کچھ کام بھی کرو، کچھ کر کے دکھاؤ۔ کسی جگہ میں نے ان لوگوں کا ذکر کیا تھا جو حال مست ہوتے ہیں، ان کا بھی کیا ہو گا جو مال مست ہیں۔ اس مقام پر تو مال مست سے حال مست بہتر ہیں مگر اُن دونوں سے بہتر کردار مست ہیں۔ میں تو کار مست کہنے کو تھا مگر اس لیے رُک گیا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مستی موٹر کار کی وجہ سے ہے۔ اقبال نے کہا ہے:۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال	ملاّ کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
وُہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو	ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

ان دونوں اشعار کے درمیان ایک اور شعر بھی ہے جس کو میں نے اس موقعہ پر غیر ضروری

سمجھا تھا مگر مجھے اب کچھ شک سا ہونے لگا ہے کہ صاحب صدر کہیں شاعر نہ ہوں
چنانچہ اُن کے فائدے کے لیے وہ بھی سُنا دیتا ہوں۔ سے

شاعر کی نوا مُردہ وافسردہ وبے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

اور وہ شک مجھے اس طرح ہوا کہ صاحب صدر نے پرسوں یا اترسوں یا نرسوں ٹیلیفون
کیا۔ یہ اترسوں اور نرسوں کا فرق مجھے برسوں میں معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال کوئی دن تو ہو گا
جب انھوں نے ٹیلیفون کیا تو سب سے پہلے یہ پوچھا "خان صاحب کیا حال ہے
آپ کا؟" مجھے ابھی تک کسی نے خان صاحب نہیں کہا تھا سوائے ایک سیشن جج
کے جو خان صاحب اس لیے کہتا تھا کہ میں اُسے چودھری صاحب کہوں۔ لہٰذا مجھ پہ
ایک غیر معمولی جذبہ جس کو آپ جذبۂ افغانیت کہہ سکتے ہیں، طاری ہوا۔ یہ جذبہ دیر پا
نہ تھا کیونکہ یاد آیا کہ خان صاحب پاؤنڈوں کو بھی کہتے ہیں۔ میں سمجھا کہ صاحب صدر کسی
غلط آدمی کو ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے پُوچھا "کون سے خاں صاحب؟
آپ کون صاحب ہیں؟" یہ میں نے بدلے کے طور پر کہا تھا کیونکہ خان صاحب اور
کون صاحب میں زیادہ فرق نہیں۔ وہ بولے میں ہوں محمد منور۔ اب آپ پوچھیے کہ
اگر ٹیلیفون والے اتنے بڑے نام پر دو آنے کی بجائے تین آنے چارج کریں تو
بے جا ہو گا؟ اور کس قدر مشکل سے بولا جاتا ہے۔ ایسے ثقیل ناموں کی وجہ سے ہی
تو ٹیلیفون کے تار کند ہو جاتے ہیں اور بات سُنائی نہیں دیتی اور پھر آپریٹر سے کہتے
ہیں کہ بھائی پیسے تو آپ اُتنے ہی چارج کریں گے مگر سُنائیں نے کچھ بھی نہیں۔
اور وہ اپنی سرکار پر ذمہ داری ڈالتا ہے کہ لوڈ بڑھ گیا۔ مگر سرکار کا لوڈ تو ہمیشہ سے بھاری
تھا سرکار کب ہلکی تھی۔ اور سرکار کا لوڈ گھٹانے کے لیے آپریٹر اب خود ٹیلیفون پر ہلکی
قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر اُس وقت جب مرد گھر میں نہ ہوں۔ ہاں تو میں

نے یہ تو کہیں پڑھا تھا کہ ایک شخص کا نام محمد مکھن تھا اور اس سے کسی شاعر نے لسّی مانگی۔ اس نے قیمت کے طور پر ایک ایسے شعر کی فرمائش کی جس میں اس کا نام بھی آئے۔ شاعر نے کہا: ع

عالم ہمہ دوغ است و محمّد مکھن

مگر یہ محمد منوّر نہ تو قافیے میں آتا ہے نہ ردیف میں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر صرف ایک ضعیف سا مُستزاد حاصل ہُوا۔ ع

ترے دم سے ہے بزمِ اقبال قائم۔ محمد منوّر

دوسرا مصرعہ جدید اُردو میں لکھا ہے۔ ع

ترے خاں صاحب کا ہو خان صاحب۔ محمد منوّر

یعنی خدا غارت کرے تیرے خاں صاحب کو" جیسے کہا ہے کوئی ہو تیر اصفا صفاً ان دونوں مصرعوں کے کسی حصّے میں سے ضرور کسی کی تاریخِ وفات نکلے گی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ آرام سے دیکھ لیجئے گا۔ اب میں پھر "مستیٔ کردار" کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اقبالؒ نے بعد میں سوچا کہ اگر صوفی اور مُلّا اور شاعر تینوں ناراض ہو گئے تو صرف محمد منوّر مجھے کہاں تک بچائیں گے۔ اِس لیے انھوں نے سارا قصور اپنے ذمے لے لیا۔ یہ تو نہ کہا کہ میں کردار سے عاری ہوں مگر یہ ضرور کہا کہ میں کردار کا غازی نہ بن سکا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کردار کی حد تک وُہ غازی تو نہ بن سکے لیکن غازی سے فرا کم رتبے کا درجہ اُنھیں حاصل ہو گیا تھا یعنی وہ کردار کے قاضی بن گئے تھے۔ آپ اقبالؔ کو گفتار کا غازی کہیں یا کردار کا قاضی، جو کام قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا وہ اُس نے بڑی دیانت داری سے پُورا کیا۔ ؎

اقبالؔ بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اچھا وہ تین سوال جو میں آپ سے پُوچھنا چاہتا تھا وُہ تو یونہی رہ گئے اور میں شہید گفتار ہوًا اور ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ پُوچھوں یا نہ پُوچھوں۔ اور اگر پُوچھوں تو پہلے کون سا سوال پُوچھوں۔ جس طرح میر تقی میرؔ نے یہ سوچ کر کہ

سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

صبر کر لیا تھا میں بھی اسی میں مصلحت سمجھتا ہُوں کہ یہ سوال ہی نہ کرُوں اور اگر آپ نے میرے تین سوال سُن لیے ہیں تو آپ کی قوتِ سامعہ نے جلد بازی کی ہے بہرکیف طور پر تو وُہ ابھی معرضِ وجُود میں نہیں آئے۔ ابھی وُہ تصورات کی بستیوں میں پراگندہ ہیں۔ اگر آپ کے خیالات ان سے متاثر ہوگئے ہوں تو ہونے دیں میں اتنا خود غرض نہیں کہ آپ کے خیالات کو بھی منسوخ کر دُوں۔ البتہ یہ آرزُو کا لفظ جو اس مصرعہ میں استعمال ہوًا ہے۔

مدّت سے آرزُو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

وُہ ان معنی میں بیان نہیں ہوًا جو اقبال کی شاعری کا لُبِّ لباب ہیں۔ یہاں تو صرف یہی مُراد ہے کہ تم بھی بڑے افلاطون تھے بلکہ خان صاحب تھے۔ اب یٹنگ ہو جاتے یہ یٹنگ کا لفظ میں نے پشتو سے لیا ہے مگر اس کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ ہاں تو خاص مقامات پر اقبال نے آرزو کو ایسی اُونچی کُرسی پر رکھا ہے کہ دل یہی چاہتا ہے کہ آرزو پُوری ہی نہ ہو اور ناتمام رہے اور اس کے حاصل کرنے میں ہی ساری کوشش بلکہ ساری زندگی صرف ہو۔ مثلاً

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

یہ آدم کی پیدائش کے وقت کی بات ہے۔ اُس وقت تک دُنیا میں کوئی آرزو نہ تھی بس ایک درخت کا پھل کھاتے اور سو جاتے تھے یا پھر ننگے پھرتے

تھے۔ جب زندگی آئی تو اس کی گود میں آرزو بھی آئی۔ آرزو نے آنکھ کھولی تو ایک نئی دنیا نے جنم لیا۔ اب اگر آرزو وہیں ختم ہو جاتی تو زندگی کا بردا بے ڈھر بہتا۔ اور آپ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ اقبال کی آرزو کیا ہے "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" نہیں۔ ابراہیم نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھ کر کہا کہ یہی خدا ہوگا۔ مگر وہ ڈوب گیا تو کہا کہ خدا ڈوبنے والا تو نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اقبال کی آرزو ئیں بھی مٹی میں نہیں مل سکتیں۔ مئی کے مضمون پر بنیادوں سے زیادہ "خاکم بدہن" کہہ کر چلا جاتا ہے وہ بھی تکلّفاً کیونکہ خدا سے شکوہ کر رہا ہے اور یہ ڈر دامن گیر ہے کہ کہیں فرشتے خدا کے حضور میں اُس کی بُرائی نہ کریں۔ فرشتے اپنی عادت سے مجبور ہیں وہ انسان کی بُرائی کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر چند کہ خداوند دانا و بینا ہے پھر بھی وہ کبھی کبھی فرشتوں کی سُن لیتا ہے کیونکہ انھیں ہر وقت قُرب حاصل ہے اور مقربین کا کچھ نہ کچھ پاس تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ الغرض اقبال نے جب کہا کہ

"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو"

تو اس طرح سے کہا جیسے ہم خط کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ آپ کا تابعدار۔ حالانکہ ارادہ ہرگز تابعداری کا نہیں ہوتا اور اقبال کا جسم مٹی کا ہو تو ہو اس کا خیال ہمیشہ آسمانوں پر پرواز کرتا رہا اور یہی اُس کی آرزو کی تعبیر ہے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یعنی ہمیشہ کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی لگن رہے اور خدا کرے کہ یہ آرزو اور یہ بے قراری کبھی ختم ہی نہ ہو، تاکہ جو چیز اب ہے اس سے بہتر وجود میں لا سکوں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اور تو ہم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرسکتے بچے ہی پیدا کریں گے۔ مگر ایسا کرنے میں یقینی نہیں ہوتا کہ نیا بچہ پچھلے سے زیادہ حسین یا زیادہ ذہین ہوگا۔

اس لیے نئی نئی شادیاں کرتے رہتے ہیں تاکہ مرحلۂ شوق کبھی طے ہی نہ ہو۔ اقبال نے شادی کی طرف توجہ نہیں کی اور تخلیق کو تولید کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس کا آرزومند انسان تو

آفریند کائناتِ دیگرے
قلب را بخشد حیاتِ دیگرے

نئی دنیا پیدا کرتا ہے جو غالباً روس اور امریکہ کی طرف اشارہ ہے جو آجکل آسمانوں کے احتساب میں مصروف ہیں۔ مگر آپ کو اس کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے لیے تو نعرۂ تکبیر ہی کافی ہے۔ ~

گفتند لب ببند و ز اسرار ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزو است

انھوں نے کہا فطرت کے راز جو ہم نے تمھیں بتاتے ہیں کسی کو نہ بتاؤ میں نے جواب دیا منظور ہے البتہ مجھے نعرۂ تکبیر لگانے کی اجازت ہونی چاہیئے' یہ اجازت مل گئی اور اب آپ آرام سے نعرے لگاتے ہیں اور فطرت کے اسرار بے نقاب کرنے کا کام آپ نے روس اور امریکہ کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ سب آپ کی تن آسانی کا نتیجہ ہے ورنہ اقبال تو یہ چاہتا تھا کہ فطرت کے راز نہ صرف افشا کیے جائیں بلکہ اُن پر اضافہ کیا جائے۔ ~

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

مگر جو کچھ کرنا ہو وہ اس طرح کرو کہ اس میں ایک ولولہ نظر آئے' اس میں تڑپ پیدا ہو۔ جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی بے قراری ہو۔ اس کام کے لیے وہ جسم کو چھوڑ کر رُوح کو مامور کرتا ہے کیونکہ جسم رُوح کے زور سے چلتا ہے اور جسم زوال پذیر ہے۔

رُوح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حُسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیٔ بے آب ہے

مفسرین کے کہنے کے مطابق گم گشتہ شے سے مترنم جاندار مراد ہے جیسے کوئی جنگی فیکٹری یا آموں کا باغ یا رہائشی مکان میں بھی ایک گائے گورداسپور میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں وہاں کے ناظرنے لکھا کہ وہ طغیانی میں بہہ گئی ہے۔ یہاں سے ایک ہندو دوست نے جاتے ہوئے اپنی گائے دی کہ یہ کسی قصائی کے ہاتھ لگ جائیگی اُس سے تو آپ بہتر ہیں۔ بعد میں جب میں نے سُنا کہ گورداسپور والی گائے طغیانی میں بہہ گئی ہے تو سوچا کہ بہہ کر ادھر ہی نکل آئی ہوگی ممکن ہے یہ وہی گائے ہو۔ زیادہ غسل کرنے سے صرف رنگ بدل گیا ہے اور رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ یہ وہی گائے ہے کیونکہ وہ دودھ بھی ویسا ہی سفید تھا۔ مکان نہ ملا تو گائے ہی سہی۔ دراصل میں بھی اچھا خاصا مہاجر ہوں۔ یہ لوگ تیرہ سال کے مہاجر ہیں میں تیرہ سو سال کا نکلا ہوا ہوں۔ اور دادا پردادا کے وقتوں سے تو باقاعدہ ہجرت کرتا رہا ہوں محض اسلامی جذبے کے تحت یہاں کے لوگوں کو تیر و سناں کا فن سکھانے کی خاطر اپنا سنگلاخ ملک چھوڑ کر کبھی کبھی اس طرف چھاپہ مارتا تھا۔ پھر یہاں کے دوستوں نے کہا کہ یہیں رہ جاؤ ہر سال چھاپہ مارنے سے کیا فائدہ۔ ایک ہی سیر حاصل چھاپہ مارو۔

مگر میں موضوع سے دُور نکلتا جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر کوئی موقعہ ہجرت کا نکل آئے گا۔ اس وقت تو میں نے صاحب صدر سے صرف آدھ گھنٹے کی سمع خراشی کی اجازت لی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ اقبال کے متعلق ہو۔ اگر آپ مجھے پہلے کہتے کہ یوم اقبال کے پندرہ دن بعد بھی ردالشمس کے طریقے سے یومِ اقبال واپس ہو سکتا

ہے تو میں اخبار والوں سے کہتا کہ تحقیق نکالو ایک سُرخی "علامہ اقبال لائلپور میں" اور اقبال کے متعلق ایسا پھر کہتا ہُوا لطیفہ سُناتا کہ اقبال نے خود بھی نہ سُنا ہوتا۔ اب تو اس کے متعلق آپ نے اتنا کہا سُنا ہے کہ سوائے ابوہریرہ کے حُقّے کے اور کچھ رہا ہی نہیں اور کچھ رہا ہے تو یا تو وہ لطیفے ہیں جو مجھ جیسے لوگوں کو معلوم ہیں جن کے سامنے وہ اُٹھتے بیٹھتے متضاد اور جو مرتے دم تک اُن کو قیام پاکستان کے بارے میں رائے دیتے رہے (لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری ملاقات اُن سے اُن کی وفات کے بعد ہوئی) یا وہ تنقیدیں ہیں جو اقبال کے وہم و گمان میں بھی کبھی نہ آئی ہوں گی۔ دراصل ایسی تحریروں کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اُن کے بغیر خاطر خواہ طریقے پر دماغی کوفت نہیں ہو سکتی اور اگر دماغی کوفت نہ ہو تو اطمینان نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی تحقیق کی گئی ہے مثلاً یہ سنیئے :۔

"ان تمام مباحث سے ثابت یہ ہُوا کہ اقبال کا نظریہ حُسن معروضیت موضوعیت کا ہے جسے ہم معنوی مناسبت کی بنا پر وحدت جمال کے نام سے موسوم کر چکے ہیں اور یہی نظریہ اپنی جگہ پر صحیح اور جامع بھی ہے۔"

اپنی جگہ پر تو سب کچھ صحیح ہوتا ہے مگر سب کچھ اپنی جگہ پر رہتا کب ہے حضور کو ساری تکلیف اس وجہ سے پیش آ رہی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال کہتا ہے کہ حُسن عارضی ہے یعنی اس پر زوال وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اللہ میاں کے ساتھ اچھا خاصا معرکہ ہُوا۔ عروج دے کر گرا دینا خدا کی پرانی عادت ہے۔ چنانچہ ابلیس کے علاوہ حُسن بھی زوال کا شکار ہُوا۔ لیکن چونکہ خدا خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اس لیے حُسن نے شکایت کی جسارت کی۔ ؎

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا

خدانے جو جواب دیا وہ پھر کسی دن سناؤں گا۔ بات یہ ہے کہ وہ جواب خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو معروضات اور موضوعات کے دھوئیں میں اپنا مطلب بظاہر آشکار کر کے چھپا سکتا ہوں۔ لہٰذا بتاتے دیتا ہوں تاکہ آپ کی حسین راتیں بے قراری میں نہ گزریں۔ خدانے جواب دیا کہ چونکہ دنیا کی نمود رنگ تغیر سے ہوتی ہے لہٰذا

وہی حسین ہے حقیقت زوال ہو جس کی

اسی طرح کے جواب ہمارے ایک پروفیسر بھی دیا کرتے تھے۔ اگر اُن سے آپ پوچھتے کہ معروضات کیا ہیں تو وہ کہتے "معروضات! جیسے موضوعات! یہ سارے ایک قسم کے لفظ ہیں۔ واردات، مُسمات، لات ومنات۔ ان کو ہم قافیہ الفاظ کہتے ہیں اور معروضات تو آسان ہے۔ جب اس کو معروضیت پڑھیں تو واقعی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ تو گویا معروضیت کے معنی ہوئے معروض کی جمع اور مفعول کے وزن پر ہے۔ یہاں تک تو میں نے بتا دیا ہے۔ اب آگے تم ڈکشنری دیکھ کر اپنی علمیت میں اضافہ کر لو"

اللہ میاں نے بھی حسن کو یہی جواب دیا کہ جاؤ اقبال سے پوچھو یا پھر اقبال کے بعد اُس کے مفسرین آئیں گے۔ ساری باتیں پہلے ہی دن نہیں پوچھا کرتے۔ ازل سے زوال کا کیا تعلق۔

میں کہہ رہا تھا کہ جناب نقاد کو یہ تکلیف پیش آتی ہے کہ کسی جگہ تو اقبال حسن کو عارضی بتاتا ہے اور کسی جگہ کہتا ہے کہ یہ تو ہمارے مشاہدے کی بات ہے یا خیال کی بات ہے جس کو حسین سمجھیں وہ حسین ہے جس کو قبیح سمجھیں وہ قبیح ہے بعض لوگ سُور کا نام نہیں لیتے تاکہ اُن کی زبان پلید نہ ہو جائے اور اس کو "خنزیر" یعنی بُرا جانور کہتے ہیں اور بعض لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو محبت سے "PIGGY"

کہتے ہیں جوپگ سے اسم تصغیر ہے اور اسی طرح اقبال کہتا ہے کہ ع

آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

نہ دیکھے تو بس قطرہ ہے۔ یا سہ

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من

چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکار من است

یعنی مجھے کوئی چیز نظر آئے تو وہ ہست ہے نظر نہ آئے تو نیست ہے

مگر میں پوچھتا ہوں کہ میری نظر میں خواہ آپ کتے کی مانند کیوں نہ ہوں آپ کے حسنِ مطلق

پر کیا اثر پڑتا ہے بشرطیکہ آپ عام دنیاوی اعتبار سے حسین ہوں اور باقی رہی

بات زوالِ حسن کی تو مناسب جواب یہ تھا کہ ع

کیا کم ہے یہ شرف کہ ہے حسن چند سال

اور اگر دنیا میں بدصورتی نہ ہوتی تو پھر سارے لوگ خوبصورت ہوتے اور خوبصورتی

کی کوئی قدر نہ ہوتی۔ بات یہ ہے کہ انسان تغیر چاہتا ہے اور جب زیادہ حسن سے

اُس کی طبیعت اُکتاتی ہے تو بدصورتی کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں سُنی

آپ نے کہانی اُس شخص کی جو ایک چیچک رُو سے محبت کرتا تھا کسی نے پُوچھا

کہ تمھیں کیسے پسند آیا تو اُس نے کہا جب فٹ بال کھیلتے وقت اس کے

چہرے کے داغوں میں پسینہ چمکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے آسمانِ حسن پر تارے

چمک رہے ہوں۔ اچھا چھوڑیے اس معروضیت اور موضوعیت کے قصے کو چونکہ

آپ نے مجھے بزمِ اقبال میں شرکت کے لیے بلایا ہے میں آپ کو اقبال کے

بارے میں ایسی باتیں سناتا ہوں جو آپ نے پہلے کبھی نہ سُنی ہوں گی۔

ایک دفعہ اقبال اپنے چند احباب کے ساتھ لائلپور آنے والے تھے مجھ سے

اصرار کیا کہ تم بھی ساتھ چلو۔ میں تیار ہو گیا۔ راوی کے اُدھر نواب ذُوالفقار علی خاں کی

موٹر کھڑی تھی ہم دونوں پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور سمجھا کہ نواب صاحب بیٹھ گئے ہیں اور موٹر چلا دی۔ شاہدرہ تک ہم آئے تو اقبال نے کہا "لائلپور چلو" ڈرائیور نے مڑ کر یہ دیکھا کہ نواب صاحب نہیں ہیں تو زور سے بریک لگا کے گاڑی روک دی۔ ڈرائیور نے کہا "حضور نواب صاحب تو پیچھے رہ گئے" اقبال نے کہا "کوئی ہرج نہیں۔ وہ اور سردار جوگندر سنگھ ساتھ آئیں گے" آگے چل کر ہم نے دیکھا کہ قلعہ شیخوپورہ کے قریب سردار جوگندر سنگھ سکوٹر پر جا رہے ہیں۔ ان کو ہم نے ساتھ لیا اور سکوٹر سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ وہ سکوٹر کی سواری پر بہت مُصر تھے انھوں نے بتایا کہ نواب صاحب دوسری موٹر میں چلے گئے ہیں مگر میں نے اُن سے شرط لگائی ہے کہ میں سکوٹر پر اُن سے پہلے پہنچوں گا۔ خیر جب موٹر چلنے لگی اور سردار جوگندر سنگھ کا پسینہ سوکھنے لگا تو انھوں نے خوشی میں کہا "کیسی خاموش گاڑی ہے کہ بغیر آواز کے اتنی تیز ہو جاتی ہے اور میرا سکوٹر تو بڑا وجّال ہے بلکہ خرجّال ہے" یہ اُن کے اپنے الفاظ ہیں۔ میں نے کہا "یہ خاموشی صرف موٹر ہی پر منحصر نہیں جو بھی دنیا میں تیز رفتار ہیں وہ خاموشی سے کام کرتے ہیں" اس کے اگلے ہی دن اقبال نے یہ شعر سُنائے۔

کیسے پتے کی بات جوگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرامِ ناز
مانندِ برق تیز مثالِ صبا خموش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

آخری شعر میں "میں نے کہا" کا ٹکڑا شاعرانہ نازک خیالی ہے۔ دراصل یہ بات

ہیں نے کہی تھی۔ چنانچہ مَیں نے نازک طریقے سے اعتراض بھی کیا۔ انھوں نے کہا "ہم اور تم ایک ہیں" میں خوش ہو گیا۔ اس بات کا گواہ سردار جوگندر سنگھ ہے اور اگر آپ نہیں مانتے تو آپ سے پہلے بھی لوگ ایمان نہیں لاتے تھے۔ بہر کیف قصہ لاٹیپور کی سڑک سے بھی زیادہ لمبا ہو گیا۔ یہاں دیر سے پہنچے۔ سرکٹ ہاؤس میں رات کو آرام کیا۔ تین بجے رات کو آنکھ کھلی تو شہر میں لاؤڈ سپیکروں کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اقبال نے کہا "کہیں ایک گھروں میں آگ لگی ہو گی"۔ میں نے کہا "کہیں بلوہ نہ ہو" جوگندر سنگھ نے کہا "گوردوارہ میں خیرات بانٹ رہے ہوں گے"۔ ہم نے چوکیدار کو بُلا کر پوچھا۔ اس نے کہا "مسجدوں میں سرکاری اذانیں دی جا رہی ہیں" ہم نے پوچھا "سرکاری کیسے؟" کہا "لاؤڈ سپیکر تو انگریزی چیز ہے نا۔ لاؤڈ سپیکر میں سے اذانیں ہو رہی ہیں اور چونکہ ایک وقت پر ہو رہی ہیں اس لیے عمل غباڑہ ہے اذان تو اصلی وہ ہوتی ہے جو اپنے گلے کی آواز سے ہو۔ سُنا ہے رسول اللہ صلعم کے وقت میں ایک خاص مؤذن تھا جس کی آواز سارے مدینے میں سُنی جاتی تھی" اقبال نے ہم سے کہا کہ یہ چوکیدار بلال رض کا ذکر کر رہا ہے۔ پھر وہ دو گھنٹے تک ایک محویت کے عالم میں رہے۔ اس کے بعد بلال پر شعر کہے جو بانگِ درا کے صفحہ ۸۰ پر ہیں۔ بلال ایک حبشی غلام تھا اس لیے اقبال نے کہا: ع

تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

مگر یہ لاؤڈ سپیکر کا اثر تھا جس سے اقبال سمجھا کہ بلالی اذان اس لیے نہیں دیتا تھا کہ لوگ نماز پڑھیں بلکہ اذان اُس کے لیے اظہارِ عشق کا ایک بہانہ تھی۔ اور مؤذنوں کو دیکھیے جو اذان کو مصنوعی بنا کر اس کا روحانی نغمہ اس کا ولولہ اس کی بلالیت کھو بیٹھے ہیں۔ لہٰذا اقبال نے بلال کو مخاطب کر کے کہا: ؎

اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی　　نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

اگلے دن ہم سیر کرتے ہوئے کھدّر کے کارخانوں کو دیکھنے گئے۔ اقبال نے کارخانے کے مالکوں کو جمع کر کے کہا کہ اچھا مال بناؤ اور کارخانے کی بجائے ٹیکسٹائل مل بناؤ کیونکہ

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تک
چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

پھر ان لوگوں نے اتنی ترقی کی کہ اب مزدوروں کے کفن لائلپور ہی میں بنتے ہیں۔ مزدور کیا، سرکاری طبقے، متوسط الحال طبقے اور حدیہ ہے کہ خوددار طبقے بھی دولت کے جلوے دیکھ کر اپنے روحانی کفن یہیں تیار کراتے ہیں۔ کل رات اقبال میرے خواب میں آئے، اب میرے خوابوں میں بھی لوگ آنے لگے ہیں۔ صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ رات کو وضو کر کے ایک تسبیح اس طرح پڑھتا ہوں۔ ع

ساڈے خواباں وچ آیا کرو

پھر کوئی اہل نظر آ جاتا ہے۔ اقبال نے سفید چادر اوڑھی ہوئی تھی اور راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم ساتھ تھے۔ مجھ سے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں"۔ میں نے کہا "پچھلی یادیں تازہ کر رہا ہوں مگر یہاں کی تجارتی فضا نے مجھے دلگیر کر دیا ہے"۔ انھوں نے فرمایا کہ مکڑے اور مکھی کی نظم جو میں نے بچّوں کے لیے لکھی تھی وہ آج شام کو پڑھو دل خوش ہو جائے گا۔ اس میں تمھیں اور یہاں کے لوگوں کو ہدایت کا راستہ نظر آئے گا اس لیے اس حکم کی تعمیل میں کچھ حصے پڑھے دیتا ہوں۔ باقی کے لیے دیکھو بانگِ درا صفحہ ۱۲۔

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمھارا

لیکن مری کُٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سُنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا
اس حال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اُترا

مکڑے نے کہا آپ مجھ پر یُوں ہی شک کرتی ہیں۔ میں تو محض فی سبیل اللہ مہمان داری کرتا ہوں اور اپنے مہمانوں کو گھر کے عجائب خانے میں طرح طرح کی چیزیں دکھاتا ہوں سہ

لٹکے ہُوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینے سے ہے مَیں نے سجایا

مکّھی پھر بھی نہ مانی اور کہا کہ

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سوجائے کوئی ان پہ تو پھر اُٹھ نہیں سکتا

اس کے بعد مکڑے نے طریقہ بدلا اور خوشامد کا راستہ اختیار کیا اور کہا رانی! خُدا نے تمھیں رتبہ دیا ہے، بڑا حُسن دیا ہے، آنکھیں تمھاری ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں ہیں، سر کلغی سے سجا ہے: سہ

یہ حُسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہُوئے گانا

مکھی نے یہ سُنا تو پسیجی اور کہا۔ ہاں یہ باتیں تو مجھ میں ہیں اور بعض دفعہ اس خیال

سے بھی کہ کسی کا دل نہ ٹوٹے کھانا بھی قبول کر لیتی ہوں۔ ؎

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اُسے پکڑا

تو اے دوستو ! میں تو یہ پڑھ کر صبح ہی صبح یہاں سے بھاگ رہا ہوں اور آپ کو خدا اور اس کے مکڑوں کے سپرد کرتا ہوں۔ آپ کو پھر کبھی یاد آؤں تو وہ تسبیح پڑھ لیا کرو
"ساڈے خواباں وچ آیا کرو"

تُو معنیٔ والنّجم نہ سمجھا تو عجب کیا

یومِ اقبال۔ لاہور

۲۱راپریل ۱۹۶۲ء

آج اس پلیٹ فارم پر میں آپ کے سامنے تین سال کے بعد پیش ہو رہا ہوں۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ مجھے اقبال کے صرف تین شعر یاد ہیں جو کبھی فرصت میں آپ کو سُناؤں گا۔ وُہ تین شعر میں نے خواجہ عبدالرحیم کے اصرار پر یاد کیے تھے۔ اُن سے مَیں نے کہا تھا کہ اُردو میں مَیں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ انھوں نے کہا اچھا انگریزی ہی میں سہی۔ مگر حمید نظامی کا خیال تھا کہ میں اُردو لکھ سکتا ہوں۔ لکھنے کو تو میں ملتانی بھی لکھ سکتا ہُوں مگر سچی بات یہ ہے کہ بہت دنوں تک مَیں ہیر کو ہیر رانجھا کے افسانے کا ہیرو سمجھتا رہا۔ یہ تو اب تک آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہو گا کہ مذکر اور مؤنث کے سلسلے میں مَیں اکثر غلطی کر جاتا ہوں۔ حمید نظامی کو اس وقت تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اُن کے نام سے میرا حوصلہ بڑھا اور ایک گُونہ غیرت کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ مَیں اُردو میں تقریر کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ بڑی جسارت کی بات تھی۔ پھر وُہ تقریر حمید نظامی نے اپنے اخبار میں اِس طرح بڑھا چڑھا کر شائع کی اور چُپکے سے زبان کی غلطیاں اس طرح ٹھیک کر دیں کہ میں ایک پائے کا ادیب بلکہ ادیب لطیف بن گیا اور لوگ اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجنے لگے۔ وُہ سارا کلام میرے پاس رکھا ہے۔ جب مَیں اپنی اصلاح سے فارغ ہو جاؤں گا تو اُس کی اصلاح کی طرف توجہ کروں گا۔

قبال کا یا قائدِ اعظم کا ذکر کرتے ہوئے مجھے حمید نظامی یاد آتے ہیں۔ کہتے ہیں دنیا عالمِ حسرت ہے مثلاً اپنے والد کی آخری بیماری میں جب میں تعطیلات گرما کے بعد لاہور آ رہا تھا تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ کچھ دن اور ٹھہر جاؤ اور میں نے عذر کیا کہ ہائی کورٹ کے کھلنے کے وقت چیف جسٹس کی موجودگی ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کی وفات کے وقت میں اُن کے پاس موجود تھا مگر یہ حسرت دل ہی میں ہی کہ اُن کی آخری خواہش میں نے پوری نہ کی۔ اِسی طرح کی حسرت حمید نظامی کے متعلق ہے مگر وُہ اُن کی حرّیتِ خیال کی بنا پر ہے۔ جب ایک ایسا آدمی جو اعتدال سے بھی نہ بڑھے، مگر حدِ اعتدال پر کھڑے ہو کر افقِ امکاں کے بے پایاں حدود دکھا سکے۔ جو نہ لیڈر بننا چاہے، نہ ستائش کی تمنّا رکھتا ہو نہ صلہ کی پرواہ، ہمارے درمیان سے اُٹھ جائے تو محفلِ ہستی سونی ہو جاتی ہے۔ اقبال اور قائدِ اعظم کے ذکر سے اِس طرح میری حسرت تازہ ہو جاتی ہے کہ لوگ جائز طور پر سمجھتے ہیں کہ مجھے اُن دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظم کو صرف ایک فاصلے سے دیکھا تھا، اقبال کو تو دیکھا تک نہیں اور اب یہ کہتا ہوں کہ اے کاش حمید نظامی کو بھی نہ دیکھا ہوتا اور یہ قصور خواجہ عبدالرحیم کا ہے کیونکہ اُنھی کے مکان پر حمید نظامی سے ملا تھا۔

خواجہ عبدالرحیم بھر آتے اور کہا کہ اُن تین شعروں کو تو تین سال ہو گئے اگر ایک شعر فی سال بھی رکھا جائے تو ۱۸ اپریل کو دس بجے تک پچھلا حساب بے باق ہو جائیگا۔ اتنے میں تو آپ نے شاید تین اور شعر یاد کر لیے ہوں۔ میرے ایک دوست جب کسی بات پر زور دیتے ہیں تو کہتے ہیں" ایمان اللہ گل ہے کہ ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں نے بھی کہا۔ ایمان اللہ بات یہ ہے کہ میں اور کاموں میں مصروف رہا اور اِس کے علاوہ آپ نے سُنا ہوگا کہ اللہ کے دن لمبے ہوتے ہیں اور ایک دن ہزار

سال کے برابر ہوتا ہے اور یہ تو اللہ کے دن ہیں لہٰذا حساب بیباق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر اقبال کے شعر۔ اُن کا تو ہر ایک شعر ایک زندگی ہے، کہیں صبحِ زندگی، کہیں شامِ زندگی ورنہ دورانِ زندگی۔ چنانچہ میں اس بات پر تیار ہوں کہ وہ تین شعر دہراتا رہوں اور اس قدر دہراؤں کہ لوگوں کے سارے بُل نکل جائیں مگر یہاں کا دستور یہ ہے کہ شعر اُس وقت تک نہ دوہرایا جائے جب تک کوئی مکرر پڑھنے کی فرمائش نہ کرے۔

یہ سُن کر خواجہ عبدالرحیم نے کہا کہ میں ایک نئی کتاب آپ کے پاس بھیج دونگا جسے پڑھ کر آپ اقبال پر کچھ اور بھی کہہ سکیں گے۔ پھر انھوں نے ایک کی بجائے دو کتابیں بھیج دیں اور ایک پر لکھا کہ میں یہ تحفۃً بھیج رہا ہُوں۔ مگر دوسری کتاب کی دل شکنی کے خیال سے میں نے اِس عدمِ مساوات کو روا نہیں رکھا اور دونوں کو تحفۃً قبول کر لیا جو چار پانچ کتابیں اِس کے بعد میں نے خود مانگی ہیں اُن کو میں ویسے ہی رکھ لونگا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہے کہ میری اور اقبال کی مجموعی یاد آپ کو پھر کب ستائے گی یاد کرنے والے تین چار آدمی ہوتے ہیں مگر وہ ایسی ہل چل مچا دیتے ہیں کہ یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ اگر میں آپ کے سامنے نہ آیا تو آپ مایوس ہو کر شاید خودکشی کر لیں گے اور اگر آپ نے خودکشی نہ کی تو وہ محض آپ کی شرافت ہو گی۔ چھُٹی کا ایک مہینہ گزر گیا لیکن نہ میں نے کوئی کتاب پڑھی نہ کچھ لکھا۔ اِن کتابوں میں سے ایک کا نام 'جاوید نامہ' تھا جو ایک رُوحانی سفر ہے جس میں سب سے پہلے اقبال کو رومی کی رُوح ملتی ہے اب آپ ہی سوچیئے کہ چھُٹی کے مہینے میں میں زمین کی سیر کرتا یا آسمان کی اور پھر مولانا رومؔ مانا کہ بہت بڑے بزرگ ہیں مگر دن رات ان کی صحبت میں کون رہے۔ ان کی مثنوی تو فارسی زبان میں قرآن ہے اور کیا پانچ وقت کی نماز کچھ کم ہے کہ باقی وقت بھی انسان باوضو رہے اور وہ بھی چھُٹیوں کے ایام میں، وہ مہینہ بھی روزوں کا تھا۔ آزمائش

کے دن اکیلے نہیں ہوتے اور آزمائشیں بھی اُن کے ساتھ آتی ہیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ صبح کی اذان سے صبح کی نماز تک جتنے منٹ بھی ہوں جاوید نامہ لے کر آسمان کا سفر کرتا رہوں۔ آسمان بھی ایک نہیں تھا۔ رُومی کی رُوح سے ملتے ہی ہماری پرواز شروع ہو گئی اور پرواز کے دوران میں وہ وہی پچھلے سال کی پچھلی صدی کی پُرانی باتیں سناتے رہے جب انھوں نے کہا۔ ع

شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

تو میں نے عرض کیا "قبلہ میں تو حاضر ہوں مگر آپ شاید میرا کوئی اور ہم نام ڈھونڈ رہے ہیں"۔ انھوں نے اس طرح دیکھا جیسے مجھے پہچانتے ہی نہ ہوں اور آسمان کی بلندیوں کو سَر کرتے ہوئے کہا: ع

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

جس سے اُس وقت تو میری خودی ذرا مجروح ہوئی مگر بعد میں اُس کا مطلب یہ سمجھ میں آیا کہ اور تلاش کرو اور تلاش کرو کبھی ساکن نہ ہو جاؤ۔ حرکت میں رہو اس پیسے میں سر ہلاتا رہا۔

اُس دن ہم آسمان سے جلدی اُترے کیونکہ مجھے کسی کام سے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خیال ہوا کہ اس طرح بے مقصد کبھی آسمان پر کبھی زمین پر پھرنا صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اگلی صبح کو جب رُومی آئے تو میں نے دیکھا کہ پرواز کا اہتمام انھوں نے اقبال کے سپرد کر دیا تھا۔ اس بار ہم اور بھی اونچے اُڑے۔ میں نے کہا "قبلہ اگر گستاخی نہ ہو تو وہاں لے چلیے"۔ انھوں نے پُوچھا "کہاں" میں ڈر کے مارے نام نہیں لے سکتا تھا مگر میرا مطلب مقامِ معراج سے تھا۔ میں نے کہا "کوئی جگہ ہے جس پر ہمیشہ یہ جھگڑا رہتا ہے کہ آیا ہمارے رسولؐ وہاں جسمانی طور پر پہنچے تھے یا وہاں کا رُوحانی سفر کیا تھا"۔ رومی نے اقبال کی طرف دیکھا اور اقبال

نے رُومی کی طرف اور میں کبھی ایک کی طرف دیکھتا کبھی دوسرے کی طرف۔ رُومی نے پُوچھا "جاوید نامہ نہیں پڑھا" میں نے عرض کیا" پڑھ تو رہا تھا جب آپ آتے مگر پڑھنے سے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں" اس پر اقبال نے کہا: ؎

چیست معراج، آرزوئے شاہدے

امتحانی رُوبروئے شاہدے

یعنی معراج دراصل اِس آرزو کی تکمیل ہے کہ کوئی میرے امتحان کا شاہد بنے اور اس بات کی تسلی کرنے کے لیے کہ آپ مُردہ ہیں یا زندہ یا جاں برلب تین گواہوں کی ضرورت ہے۔ پہلا گواہ ہے اپنا ذاتی شعور جس کے ذریعے سے آپ اپنا تجزیہ کریں۔ دوسرا گواہ ہے دوسرے آدمی کا شعور جس کو آپ نے اس مقصد سے جگایا ہو کہ اس کی روشنی میں آپ اپنی ذات کو دیکھیں۔ تیسرا گواہ ہے ذاتِ حق کا شعور جس کی روشنی میں اگر اپنی ذات کو دیکھ سکیں تو گویا اپنے مقام پر پہنچ گئے کیونکہ ؎

بمقامِ خود رسیدن زندگی است

ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

اور اسی لیے ع

مصطفےٰ راضی نہ شد اِلاّ بذات

مصطفےٰ نے کہا کہ میں تو دیکھوں گا اور اس کو لن ترانی نہیں کہا۔

یہ بات ٹھیک سے میری سمجھ میں تو نہ آئی کیونکہ میں آپ سب کی طرح صفات میں محصور ہوں اور ہر چیز کا اسم صفت ڈھونڈتا پھرتا ہوں اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ "بجا ہے قبلہ" کہہ کر خاموش ہو رہوں اور افلاک کی سیر کرتا رہوں۔ سب سے پہلے فلکِ قمر پر پہنچے۔ آپ نے دیکھا ہوگا۔ جاوید نامہ میں چھ فلک ہیں۔ اُن پر آپ کو مختلف لوگوں کی ارواح ملتی ہیں۔ ساتویں آسمان کا ذکر نہیں ہے

یہ شاید اُن ارواح کے لیے مخصوص رکھا ہے جو اقبال کے بعد آئیں گی۔ ہم بھی اُمیدوار بن سکتے ہیں۔ اقبال سمجھ گئے کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔ لہٰذا رخصت ہوتے وقت اُنھوں نے خواجہ عبدالرحیم کو آواز دے کر کہا کہ اِس نامحرم کو میری وہ انگریزی کتاب پڑھاؤ جو میں نے اسلام میں تصورِ مذہب کے موضوع پر لکھی ہے اور پھر اِس خیال سے کہ کہیں خواجہ عبدالرحیم کوئی غلط کتاب مجھے نہ دے دیں اُس کے نام کی صراحت بھی کر دی۔

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS
THOUGHT IN ISLAM

مگر پرواز سے واپس ہو کر پھر اپنے گاؤں میں پھرنے لگا اور یہ کتاب نہ پڑھی۔ مُلتان میں ایک آدمی ملا جو بہاولپور سے آیا تھا اور صرف ملتان کی خانقاہوں کی زیارت کرنے آیا تھا۔ میں بھی خانقاہوں میں جا کر وہ کتاب تھوڑی تھوڑی دیر پڑھ لیتا۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا اس کا لُبِ لباب یہ ہے مگر پہلے ڈاکٹر ضیاءُ الدین کے ایک شاگرد تاج محمد خاں کا قصہ سُن لیجیے۔ ڈاکٹر ضیاءُ الدین علی گڑھ کے مشہور عالم ماہرِ ریاضیات تھے۔ ایک دفعہ جب کلاس میں گئے تو بلیک بورڈ پر کسی طالب علم کے ہاتھ سے یہ سوال لکھا ہوا پایا۔

"اگر آپ سچے ریاضی داں ہیں تو شبِ فراق کی لمبائی علمِ ریاضی کی رُو سے ثابت کیجیے" ؎

دعویٰ بہت ہے علمِ ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے

ڈاکٹر ضیاءُ الدین نے بلا تامّل سوال کو حل کرنا شروع کر دیا۔ ریاضی میں جب کسی چیز کی حد قائم نہ ہو سکے تو اُس کو اِن فی نٹی کہتے ہیں یعنی لامتناہی۔ ڈاکٹر ضیاءُ الدین نے کئی عددوں کو آپس میں ٹکرایا اور ضرب تقسیم دے کر ثابت کر دیا کہ شبِ فراق کا

طُول ان فی نٹی کے برابر ہے یعنی بے پایاں ہے۔ تاج محمد خاں یہ قصہ سنایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم نے ایسے اُستادوں سے ریاضی پڑھی ہے جن کا علم بے پایاں تھا یہاں پشاور میں کیا رکھا ہے۔ پشاور میں ہم دو ہی طالب علم ریاضی پڑھتے تھے اور تیسرا ہمارا پروفیسر جو تھوڑی سی ریاضی پڑھا کر زیادہ تر شیکسپیر کے بچپن کے قصے سُنایا کرتا تھا۔ ایک دن تاج محمد خاں سے میں نے پُوچھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کس طرح ثابت کیا تھا کہ شبِ فراق بارہ گھنٹے سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ اُنھوں نے کہا یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر آخری نتیجہ یہی تھا۔

اقبال کی وُہ فلسفیانہ کتاب جب میں نے پڑھی تو تاج محمد خاں یاد آتے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کس طرح اس نتیجے پر پہنچے مگر آخری نتیجہ یہی تھا کہ اسلام ایک جادۂ حیات ہے۔ اسلام عمل سکھاتا ہے، حقیقت سے مُنہ نہیں موڑتا۔ حقیقت کی تلاش میں حسِ قلبی کے ذریعے اُن مقامات تک پہنچا ہے جہاں حواسِ خمسہ کے ذریعے سے نہیں پہنچ سکتے اور آخری حقیقت کو خدا کہتے ہیں چونکہ حقیقت کی تلاش انسان کا کام ہے۔ اس لیئے مذہب زندگی کا ایک ضروری جُزو ہے اور ان سب مشکل باتوں کی تشریح دراصل خودی کی ایک تشریح ہے۔

خودی کے لفظ پر پہنچ کر میں محسوس کر لیتا تھا کہ پاؤں زمین پر ہیں۔ کیونکہ اسرارِ خودی تو ہم سے بہتوں کی زبان پر ہے بلکہ اس کے ساتھ بیخودی کے رُموز بھی آشکارہ ہونے لگتے ہیں۔ مجھے کبھی شک ہُوا کرتا تھا کہ خدا کا لفظ خودی سے نکلا ہے مگر اب یہ کتاب پڑھ کر تو یقین ہو گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے شاگرد کی طرح میں بھی شاید ایک ماہر کا آخری جواب دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شبِ فراق کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں بے پایاں ہیں۔

اِن بے پایاں چیزوں میں سب سے پہلی چیز جس پر اقبال کی نظر پڑتی ہے

وُہ قرآن ہے۔ اُس کے نزدیک قرآن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان میں اس بات کا شعور پیدا کرے۔ کہ اُس کے تعلقات خدا سے ایک طرف اور کائنات سے دوسری طرف کیا ہیں۔ اِسلام میں حقیقت اور مجاز دو مخالف طاقتیں نہیں بلکہ مجاز کی دوامی کوشش یہی رہتی ہے کہ حقیقت پر روشنی ڈالے اور اُس کو اپنا حصہ بنالے اور اسی لیئے وُہ حقیقت کی تلاش مجاز میں کرتا ہے ع

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

یہ نہیں کہتا کہ اے مجاز حقیقت کی شکل اختیار کر کے ظاہر ہو۔ اِسلام اور عیسائیت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اگرچہ دونوں انسان کی خودی کی آخری منزل روحانیت میں ڈھونڈتے ہیں اسلام مادی دنیا سے گُریز نہیں کرتا بلکہ اُس کی تسخیر کر کے کوئی ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جس پر زندگی کی عمارت بادلوں میں نہیں' بلکہ زمین پر کھڑی کی جا سکے۔ آپ سمجھیں گے کہ میں اُلٹی بات کر رہا ہوں کیونکہ مادی دُنیا کی تسخیر مسلمان تو نہیں کر رہے اور لوگ کر رہے ہیں۔ یہی بات تو اقبال کو بھی چبھی تھی اِس لیئے قرآن کی طرف رجُوع کیا تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کو فلسفے نے خراب کر دیا ہے۔" وما خلقنا السموات والارض وما بینھما لعبین ہ وما خلقنھما الا بالحق ولکن اکثرھم لایعلمون" ہم نے زمین اور آسمان کو ایک کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ نہ اُن چیزوں کو جو اُن کے درمیان واقع ہیں۔ ہم نے ان کو حق سے پیدا کیا ہے' اقبال نے یہاں 'حق' کا ترجمہ 'مقصد' کیا ہے کیونکہ جب آپ کہیں کہ یہ چیز آپ نے کھیل کے لیے نہیں بنائی تو کوئی مقصد ہوگا۔ اور یہ تو کئی جگہ کہا ہے کہ اختلافِ شب و روز میں، زمین و آسمان کی پیدائش میں، رات اور دن کے تسلسل میں' سورج اور چاندِ کی ایک مقررہ مسافت میں اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سوچتے ہیں۔ ویتفکرون فی خلق السموٰات والارض' اور آسمانوں اور زمین

کی پیدائش پر فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں (ربنا ما خلقت ھذا باطلا)۔ رب ہمارے تُونے یہ چیزیں یُونہی تو پیدا نہیں کیں! تو کیا فکر آپ کی یہی ہے کہ اِتنا کہہ کر سو جائیں۔ میں ایک کتاب مُناجات لکھوں گا اور یہ آیت اُس میں ضرور رکھوں گا مگر تب تک آپ کو ثواب سے کیوں محرُوم رکھوں۔ اِس لیئے واضح ہو کر جو شخص شبِ جُمعہ کو جب چاند چودھویں کا ہو صاف ستھرے کپڑے نائلون کے بنے ہوئے اور بجلی سے استری شدہ پہنے اور اُن پر اوڈی کولون چھڑکے اور کوری موٹر میں بیٹھ کر شالامار یا کسی جنگل کا رُخ کرے اور ہزار دفعہ کہے کہ اَے رب ہمارے تُونے شالامار اور نائلون کے کپڑے بے فائدہ تو نہیں پیدا کیئے تو اُس کو ایک ہزار حج اور ڈیڑھ ہزار عمرے کا ثواب ملے گا۔ اِس لیے مَیں بھی رات کو سوتے وقت 'حسبنا اللہ ونعم الوکیل' پڑھتا ہوں۔ مگر یہ تصدیق کر کے کہ ہمارے لیئے خدا ہی کافی ہے دن کو سوچتا رہتا ہوں۔ کہ خدا کے سوا اور تو کوئی مجھ سے ناراض نہیں۔ اور خصوصاً ووٹوں کے دنوں میں خُدا کی وکالت رات تک ہی محدود رہے تو بہتر ہے۔

اقبال کہتا ہے' اور میں بھی ادب کے ساتھ تائید کرتا ہُوں کہ تعلیم قرآن یہ ہے کہ ان چیزوں کی حقیقت فکر کے ذریعے سے معلُوم کرو "وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ" تمھیں کان اور آنکھ اور دل دیئے۔ کانوں سے تو سُنتے ہیں یہ ایک ذریعہ ہے تحصیلِ علم کا۔ آنکھوں سے آپ دیکھتے ہیں یہ ایک اور ذریعہ ہے تحصیلِ علم کا۔ دل سے آپ کیا کرتے ہیں؟ سوچتے ہیں۔ یہ دیکھیئے حواسِ خمسہ کے علاوہ ایک اور ذریعہ علم کے حاصل کرنے کا پیدا ہُوا بلکہ یُوں سمجھیئے کہ اُس سنگ وخشت سے جن کا علم آنکھ، کان اور دیگر حواس فراہم کرتے ہیں دل کا معمار کوٹی اور عمارت کھڑی کر دیتا ہے اور خدا اِسی لیئے کہتا ہے کہ دل بھی دیا ہے۔

اگر سورج اور چاند کو دیکھ کر آپ کو یہی کرنا تھا کہ اللہ کو مبارک باد دیں کہ تو نے بہت اچھا دستور قائم کیا ہے تاکہ وہ خوش ہو کر ایک اور چاند پیدا کر دے، جو لاہور کی بجلیوں کے خراب ہونے پر کام آئے، تو پھر بحیثیت ایک غیر جانبدار تماشائی کے مجھے یہ نظر آتا ہے کہ اللہ کی خودی نے تو خدائی اختیار کر لی۔ مگر آپ کی خودی گدائی کے جذبے سے آگے نہیں بڑھی۔ اور اگر یہی بات تھی تو پھر خدا نے کیوں کہا کہ یہ مخلوق بے کار کھیل کے طور پر پیدا نہیں کی ہے۔ پھر کیوں کہا کہ زمین و آسمان کو آپ کے لیے مسخر کیا ہے؟ زمین کو مسخر کرنے کے تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ اس میں کھیتی باڑی کریں۔ زمین نہایت فرماں برداری سے آپ کو فصل دے گی۔ سورج کی تسخیر آپ کس طرح بیٹھے بیٹھے کریں گے؟ یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ دسمبر کے مہینے میں صبح جب ٹھنڈ ہو تو آپ سورج کی شعاعوں سے اپنے بدن کو گرم کر لیں۔ اگر یہ بات ہوتی تو جس دن بادل ہوتے سورج یہ کہہ دیتا کہ آج مجھے بادلوں نے مسخر کر لیا ہے لہٰذا آپ کی تسخیر کو چھٹی ہے اور ایسی تسخیر، یعنی دھوپ میں بیٹھنا تو گھوڑے اور گدھے کو بھی میسر ہے۔ مسخر کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپ اس کی ساخت پرداخت، اس کے ذرات، اس کی شعاعوں، اس کے شبانہ روز اور سالانہ کرشموں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسی کو سائنس کہتے ہیں۔ گویا سائنس مذہب کا حصہ ہے۔ ایک اور جگہ کہا ہے "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں بنایا، "ثم رددناہ اسفل السافلین" پھر اس کو پست سے پست کر دیتے ہیں مگر جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان کیلئے اجر لامتناہی ہے۔ اس کا یہ تو مطلب نہیں ہو سکتا کہ پہلے آپ کو خوش اندام بنایا، پھر رذیل کر دیا۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو زندگی کے ہنگامے صرف کھیل تماشا ہی ہوتے پھر کوئی اور مطلب سوچیئے جو مقصدِ حیات کے منافی نہ ہو۔ اقبال کہتا ہے کہ جب

انسان زندگی پر آنکھ کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہیں تو کچھ بھی نہیں ہُوں۔ میرے اردگرد مضبوط طاقتیں ہیں مگر میرے پاس ایک سوچنے والا دل ہے۔ اس کے ذریعے سے کیوں نہ اِن طاقتوں پر غلبہ پاؤں۔ کسی اور نے یہ تشریح کی ہے کہ جب انسان اپنے ذہنی امکانات سے کام نہ لے کر موقعہ ضائع کر دیتا ہے تو گویا پست حالت میں رہ جاتا ہے۔ دونوں باتیں ایک ہیں کیونکہ وہ لوگ پست نہیں رہتے جو ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ ایمان تو وہی لائیگا جو قدرت کی نشانیاں دیکھے اور اُن پر غور کرے اور اُن کو مسخر کر کے کوئی نئی دنیا پیدا کرے اور یہ بھی سوچئے کہ یہ باتیں کیوں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ اب اِس نظریے کی تائید میں اُن کا کلام سنیئے۔ اِس دفعہ میں کم از کم دس شعر پڑھوں گا تاکہ آپ کے آئندہ دس سال آرام سے گزریں۔ ؎

جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہست
دریں وادی بسے گل چیدنی ہست
و لے چشم از درونِ خود نہ بندی
کہ در جانِ تو چیزے دیدنی ہست

اِس رنگ و بُو کی دنیا کو تمھیں سمجھنا ہے۔ اِس میں عمل کے پھُول بھی توڑنے ہیں مگر یاد رکھو کہ تمھارے اندر بھی کوئی چیز ہے۔ اِس اندرونی آنکھ کو بند نہ کرنا۔ اِن اشعار میں آنکھیں بھی ہیں، اور ناک بھی ہے اور دل بھی ہے۔ یہاں کانوں کا ذکر نہیں کیونکہ اکثر لوگ کانوں کے کچے ہوتے ہیں۔

پھر تسخیرِ فطرت کا باب کھولیئے۔ اِس کا پہلا حصّہ ہے میلادِ آدم۔

نعرہ زد عشق کہ خُونیں جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شُد

اب ایک صاحب نظر پیدا ہو گیا ہے وہ کائنات کے حُسن کا جائزہ لے گا وہ اس پر غور کرے گا۔ وہ تخلیق کے رازوں کو بے نقاب کرے گا مختصر آپ کہ سائنس اور فلسفہ رائج ہو گا۔ سکول اور کالج کھلیں گے۔ یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا۔

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد

زندگی جو مٹی میں اسیر تھی اب حرکت میں آ گئی۔ اب کہیں دروازہ کھلا اور کسی دیکھنے والے نے جھانکا۔ اب ضرور کچھ دردو نشاط کے نغمے بلند ہوں گے۔ ع

زندگی سوزو سازبہ زسکونِ دوام

اور ع

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوزو ساز کردن

زندگی میں سوز پیدا کرو اس میں ساز پیدا کرو، بلکہ ہو سکے تو ہوائی جہاز بھی۔

ع رہ آسمان نوردن، بہ ستارہ راز کردن

آپ کا خیال ہو گا کہ یہ آسمان کا راستہ اختیار کرنا اور ستاروں کے راز حاصل کرنا شاعرانہ نازک خیالی ہے مگر اب تو آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ یہ عین قرآنی حکم کی تعمیل ہے "پیامِ مشرق" میں خُدا اور انسان کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ خُدا کہتا ہے کہ میں نے مٹی اور پانی سے دُنیا بنائی اور تُو نے اس میں پاکستان اور ہندوستان بنا دیئے۔ میں نے لوہا پیدا کیا تُو نے اس سے شمشیر اور بندوق بنا دی اور بالآخر ع

تبر آفریدی نہالِ چمن را قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

اودھر درختوں کو کاٹنے کے لیئے کلھاڑی بنائی، اُدھر پرندوں کو قید کرنے کے لیے پجرہ بنادیا۔ اللہ میاں کی اِس شکایت پر اقبال نے جواب دیا کہ تُو نے ہی میرے ارد گرد خارجی طاقتوں کو جمع کر کے اُنھیں مسخر کرنے کا حکم دیا تھا۔ دیکھ کر میں نے کس طرح اُنھیں مسخر کیا ہے۔ ع

تُو شب آفریدی، چراغ آفریدم

تُو نے اندھیری رات پیدا کی مَیں نے چراغ پیدا کیا۔

ع سفال آفریدی، اَیاغ آفریدم

تُو نے مٹی پیدا کی مَیں نے خوبصورت پیالہ بنایا۔ ؎

بیابان و کہسار و راغ آفریدی

خیابان و گلزار و باغ آفریدم

یعنی جو کچھ مجھے تجھ سے ملا اُس کو بہتر کر دیا۔ ؎

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نُوشینہ سازم

پتھر کو اِتنا صاف کرتا ہوں کہ آئینہ بن جاتا ہے۔ اور زہر کو نوشدارو بنا دیتا ہوں یہ سب تیری منشا کے مطابق ہے اور اِسی طرح کمال کو پہنچنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مَیں نے ابتدا میں معراج کا ذِکر کیا تھا۔ ضربِ کلیم میں، جسے اقبال نے خود دورِ حاضرہ کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے، چند شعر معراج پر اِس طرح لکھے ہیں:۔ ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز

کر سکتا ہے وُہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج

ناوک ہے مسلماں، ہدف اس کا ہے ثُریا
ہے سرّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

گویا معراج کی تفسیر یہی ہے کہ مسلمان رہے زمین پر لیکن نشانہ اُس کے تیر کا ہو ثریا کی بلندی پر۔ سورۂ نجم بھی معراج کے متعلق ہے۔ اقبال کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے۔ پڑھنے والوں کے علاوہ سُننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیئے۔ اور کچھ نہیں تو تیمم ہی سہی۔ ممکن ہے آپ کی تقدیر میں تیمم ہی لکھا ہو، مسلمان جو ہوئے۔

اگر مضمون بے جا طوُل نہ پکڑ رہا ہو تو تقدیر کے بارے میں اقبال کا نظریہ بھی گزارش کروں۔ اقبال کا خیال ہے کہ تقدیر کا ذکر جہاں قرآن میں ہوا ہے اُس کا تعلق تمام وقت یا مجموعی وقت سے ہے۔ میں اِس کی تشریح اچھی طرح نہیں کر سکتا اِس لیئے اگر ضرورت پڑے تو تاج محمد خاں والا فارمولا استعمال کر لیں۔ وقت کے تین حصے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ کیا آپ ماضی کو سچ مچ پیچھے چھوڑ سکتے ہیں۔ وقت ایک جاری ندی ہے جو ماضی کو حال تک پہنچاتا ہے۔ اور پھر حال کے ساتھ مستقبل کی طرف جاتا ہے۔ مستقبل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسے ایک طے کیا جانے والا فاصلہ، جس کو ابھی سے طے کرنا ہو، بلکہ وہ ایک کھُلا امکان ہے اور جب قرآن کہتا ہے کہ خدا نے سب چیزیں پیدا کیں اور ہر ایک کو اپنی تقدیر دی تو اس کا یہی مطلب ہے کہ ایک مستقبل اُس کے لیئے مقرر کیا جو ایک امکان ہے اور جو اُس چیز کی ذاتی قابلیتوں اور ممکنات پر منحصر ہے۔ مستقبل سے مُراد واقعات کے وُہ سربمُہر پارسل نہیں ہیں جو وقت کے بطن میں خوابیدہ ہیں اور جو مقررہ ساعت پر معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً تقسیمِ ہند کو لیجیئے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا۔ پاکستان ایک صندوق میں بند تحفہ

نہیں تھا جو چودہ اگست کو کھولا گیا، بلکہ اس کے بننے میں ایک طرف مسلم لیگ تھی اور دوسری طرف کانگریس۔ انگریز تیسری جانب۔ مختلف قوتیں ایک دوسرے کو آزماتی رہیں اور واقعات کو بناتی بگاڑتی رہیں اور گورداسپور کا ضلع دیکھئے کہ کبھی صندوق کے اندر ہوتا ہے اور کبھی صندوق کے باہر۔ ہمارے روزمرہ کے کام بھی مشین کی طرح نہیں ہوتے۔ اغراض و مقاصد کے تانے بانے سے بُنتے ہوتے ہیں اور یہی مقصد یا ارادے کا عنصر ہمارے حال کو مُستقبل کی طرف لے جاتا ہے اور اگر یہ سب چیزیں پہلے طے ہو گئی ہوتیں تو ہمیں فوج رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پولیس کی کیا ضرورت تھی؟ جسے قتل ہونا تھا ہو جاتا۔ جس کی قسمت میں چوری ہوتی ہو جاتی، اور پھر خُدا نے انسان کو قرآن کے مُطابق ایک ذمّہ دار شخصیت عطا کی ہے جو اپنے افعال کی مُختار رہے۔ وہ کسی اور کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔ صرف اپنے کیے کا بوجھ ہی اُٹھاتا ہے۔ "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی"۔ فرشتوں کے اعتراض کے باوجود انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا اور اُن سے کہا میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ اُن کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ میں تماشا دیکھنا چاہتا ہوں گرچہ تماشا لگا ضرور رہتا ہے اور پھر ایک امانت اُس کے سپُرد کی۔ یہ وہ امانت تھی جس کے اُٹھانے سے آسمانوں نے، زمینوں نے پہاڑوں نے ڈر کر انکار کیا تھا مگر انسان نے کہا کہ میں برداشت کروں گا اور انسان نے اپنے اُوپر ظلم کیا۔ یہ خُدا اپنی زبان سے کہتا ہے۔ اب بتائیے کہ مجبُوری کہاں سے آگئی، اختیاری معاملہ تھا اور یہ تو نہیں کہا کہ وُہ کیا امانت تھی مگر یقیناً وہ شخصیت کی امانت ہو گی جس کے لیے ایک اندرونی چیز کا ہونا ضرُوری تھا جس کو آپ قلب یا ضمیر یا رُوح کہتے ہیں۔ لوگوں نے پیغمبر علیہ السلام سے پُوچھا کہ رُوح کیا چیز ہے؟ بتایا "الروح من امرِ ربّی" رُوح خدا کے امر سے ہے۔ اقبال نے امر اور خلق میں فرق دکھایا ہے۔ باقی ساری چیزیں اللہ نے خلق کی ہیں۔ صرف رُوح

اُس کے امر سے ہے اور اس لیے اس کا کام بھی امر کرنا ہے یا رہنمائی ہے گویا قرآن کی ساری تعلیم خود اختیاری سکھاتی ہے اور جبر کے منافی ہے۔ اقبال کی رائے ہے کہ اگر اسلام کی خودداری کو تقدیر کے تصور نے تاراج کیا تو اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو اُس وقت کا فلسفہ تھا جو علت و معلول کے جھگڑے میں دنیا کی پہلی علت ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہ تصور کرنے پر مجبور ہو گیا کہ کوئی باہر کی ایجنسی ہے جو دنیا کو چلاتی ہے اس لیے دنیا مشین کی طرح چلتی ہے۔ دُوسرے دمشق کا خاندان اُمیہ تھا جو اس فلسفے سے فائدہ اُٹھا کر واقعاتِ کربلا کے لیے ایک ایسے سرکاری عُذر کی تلاش میں تھا جس کی رُو سے وُہ یہ کہہ سکے کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ شہیدوں کی قسمت میں شہید ہونا تھا شہید ہو گئے۔ تیسری وجہ یہ بتائی کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ رفتہ رفتہ رگِ حیات میں وُہ تپش نہ رہی جو اسلام کے ابتدائی دَور میں تھی۔ اب اسلام کو تقدیر سے بچانے کے لیے اور متحرک دکھنے کے لیے وُہ چیز ضروری ہے جس کو اسلام ملیں اجتہاد کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں جہد یا کوشش کرنا۔ اس کو سمجھانے کے لیے اقبال معاذ کا قصہ بیان کرتا ہے جس کو رسول اللہ صلعم حاکمِ یمن بنا کر بھیج رہے تھے۔ بھیجنے سے پہلے اس سے پُوچھا کہ جو امور تمھارے سامنے پیش ہوں گے اُن کا کیسے فیصلہ کرو گے۔ اس نے کہا میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر اللہ کی کتاب اس امر پر خاموش ہو تو پھر کیا کرو گے۔ جواب دیا تو پھر سنت رسول اللہ پر چلوں گا۔ فرمایا اگر سنت میں بھی کچھ نہ ملا تو۔ معاذ نے کہا اس صُورت میں اپنی رائے قائم کرنے کی جہد کروں گا۔ رسول اللہ کو معاذ سے پُوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ معاذ کوئی سکول کا بچہ تو نہ تھا، نہ گورنری کے کوئی ٹیسٹ مقرر تھے مگر مدعا یہ تھا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ صاحبانِ فکر کے لیے اجتہاد ایک ضروری آلہ ہے اور اس طرح کے سوال و جواب سے اجتہاد بھی ایک گونہ سُنتِ

رسول بن جاتے۔ اسلام کے سب سے بڑے گروہ میں تب تک اجتہاد جاری رہا
جب تک کہ چار جُداگانہ مذہب پیدا ہوئے اور پھر عملی طور پر اجتہاد کے دروازے
بند ہو گئے اور اب دنیا کا خیال ہے کہ اسلامی قانون میں نشو و نما یا تبدیلی کی کوئی
گنجائش نہیں رہی حالانکہ پہلی تین صدیوں میں کوئی اُنیس مذہب بن گئے تھے جس
کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ابتدائی عالم زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ایک
رُو بہ ترقی تمدن کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر زور شور سے دماغ سوزی کرتے رہے۔ پھر
تین صدیوں کے بعد تمدن تو بڑھنے سے نہ رُکا، مذہب رُک گیا اور اس میں اب موٹر
کا ذکر ہے نہ ہوائی جہاز کا۔ اور آپ نے اگر ماہِ رمضان میں لاہور سے پشاور جانا
ہو تو چُونکہ فاصلہ پچیس میل سے زیادہ ہے اس لیے آپ روزہ رکھ کر ہوائی جہاز میں
سفر نہیں کر سکتے۔ اقبال پُوچھتا ہے کیا اُن آئمہ نے خود بھی کبھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ تیسری
صدی ہجری کے آخری سال کے آخری دن کے بعد اجتہاد ختم ہو جائے گا اور وہ امانت
بھی واپس ہو جائے گی جو انسان کو اپنے پیدا کرنے والے سے ملی تھی۔ غالباً اس لیئے
ختم ہو جائے گی کہ انسان ظالم اور جاہل ہے اور چُونکہ ہم اب عالم اور جاہل ہو گئے
ہیں اس لیے یہ امانت اہلِ فرنگ کے پاس چھوڑ دی جائے۔ کچھ ایسا ہی سمجھوتہ ہُوا
ہو گا کیونکہ اس کے بعد سائنس اور ریاضی جیسے علُوم عرب کو چھوڑ کر ہسپانیہ کے
راستے اُدھر چلے گئے ہیں اور ہم میں سے بعض امام جماعت بنے بعض نے چار
شادیاں کر لیں، اور جو باقی رہے وُہ تقدیر کی کتاب لے کر ورق گردانی کرتے رہے۔
اس کو پڑھتے بھی نہیں اس پر ریشم کے غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ مَیں نے اس قسم کے
ایک ریشمی غلاف میں ملبُوس کتاب دیکھی۔ لباس ہٹا دیا تو یہی قرآن نکلا جس کو آپ
کبھی کبھی پڑھ بھی لیتے ہیں۔ میں نے تعجب سے کہا یہ تو قرآن ہے۔ اُس کتاب والے
نے کہا مگر اقبال کہتا ہے کہ یہ تو کتابِ تقدیر ہے۔ سنیئے: ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہُوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

تو صاحبان! اس طرح تو ئیں مانتا ہوں کہ قرآن کتابِ تقدیر ہے بشرطیکہ آپ یہ کہیں کہ اسی سے ہم نے اپنی تقدیر بنانی ہے۔ اور خدا کی تقدیر کا ہمارے ارادوں میں نہاں ہونا اس طرح ہے جیسے خون کی جگہ ہماری رگوں میں فولاد گوش کرتا ہو۔ اور تیسری بات ضمیر کی ہے جو غلامی میں بدل جاتا ہے۔ آپ کے آزاد ہونے کا یہی منشا تو نہیں ہو سکتا تھا کہ جہاں پہلے آدھے ہندوستانی انڈین سول سروس میں ہوتے تھے اب سارے پاکستانی ہوں۔ یا وزارتیں آسانی سے ٹوٹ سکیں یا تجارت آٹھ دس موٹے آدمیوں کے ہاتھ میں آجائے۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے آپ کے کھانے میں ٹماٹر کی چٹنی۔ اصل چیز تو آپ کا ضمیر ہے جو غلامی کے سو سال میں ایسا بدل گیا ہے کہ اگر آج صلاح الدین پھر زندہ ہو تو وہ آپ کو پہچان ہی نہ سکے گا۔ آپ وقتاً فوقتاً آئینہ میں دیکھا کریں کہ جب سے آپ آزاد ہوئے ہیں ضمیر کا کوئی حصہ واپس آیا ہے یا نہیں۔ اقبال کے مطابق تقدیر ہے تو سہی مگر وہ چیز جو تاک میں رہتی ہے کہ اگر آپ کا عمل ذرا کند ہو جائے تو اپنی دو دھاری تلوار آپ کے سر پر مارے۔

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اُس کی
براں صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اُس کی

رخصت ہونے سے پہلے آپ سے یہ التجا ہے کہ اسلام اور تقدیر اور
اجتہاد کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے وُہ میری رائے نہیں میں نے اقبال کی
رائے پیش کی ہے۔ البتہ نہایت ادب سے تائید کرتا ہوں اور جہاں کہیں اس
میں نمک مصالحہ ہے وُہ فقیر کا حصہ سمجھئے مگر اس سے آپ ناراض نہ ہوں نیش عقرب
سے تو میں اپنا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتا مگر نیش عقرب کی طرح میری طبیعت کا
مقتضیٰ ہے اور میں کیا کروں یہی میری تقدیر ہے۔ خواجہ حافظ نے ایک دفعہ کہا تھا
کہ اگر مسلمانی یہی ہے جو حافظ رکھتا ہے تو وائے برحال ما کہ آج کے بعد کل کا دن بھی
آئے گا۔ ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر پس امروز بُود فردائے

قاضئ شہر کو معلوم ہوا تو اُس نے حافظ کو بلایا، یا مرتد ہونے کا فیصلہ غیر حاضری
میں دے دیا۔ اُن دنوں قاضی زیادہ اختیار کے مالک تھے۔ بہر حال حافظ نے فوراً
دو مصرعے اور اضافہ کر کے مسلمانی کی توہین کسی عیسائی کے ذمہ ڈال دی۔ ؎

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گاہ می گفت
بر درِ میکدہ با دف و نئے ترسائے
گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر پس امروز بُود فردائے

تو میں بھی یہ مسلمانی اقبال کے ذمہ لگاتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض کرنا ہو تو
خط میرے نام نہ بھیجیں خواجہ عبدالرحیم کے نام بھیجیں +

اُردو اکادمی عربی گھوڑے پر سوار

اُردو اکادمی بھاولپور

آپ اور مَیں اُردو اکادمی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ ممکن ہے آپ میں سے کچھ لوگ دیکھنا بھی چاہتے ہوں کہ یہ ہے کیا چیز؟ کیونکہ اکادمی کا لفظ زانسیسی نژاد ہونے کے سبب مادام سے کچھ مناسبت یا کم از کم صوتی مشابہت رکھتا ہے اور کچھ نہیں تو مونث کے صیغے میں تو ضرور ہے۔ لہٰذا آپ میں سے کئی بے قرار ہوں گے کہ اسے دیکھیں یا کم سے کم اس کے بارے میں کچھ سنیں۔ حورانِ بہشتی کے بارے میں بھی تو ہم سنتے ہی چلے آئے ہیں اور صرف اُن کے ذکر سے اس درجہ اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے کہ اُن کی خاطر تیس روزے رکھتے ہیں اور سارا سال نماز پڑھتے ہیں۔ نیت نہ نماز کی ٹھیک ہوتی ہے نہ روزے کی، لیکن بے چارے حوروں کو نیت کا کیا پتہ۔ خیر خدا اپنی نیت کسی کے سامنے نہ لاتے۔ کم از کم میری نیت، کیونکہ آج میری نیت بھی کچھ ایسی ہی ہے یعنی میرا کوئی ارادہ نہیں کہ میڈم اکیڈمی کے متعلق ایسی کوئی بات کہوں جس سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہو بات در اصل یہ ہے کہ مجھے خود پتہ نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ مَیں نے زبیری صاحب سے جو آج کل آپ کے کمشنر ہیں، پوچھا۔ اُنھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ میرے خیال میں اگر وہ سُن نہیں لیے

تو آپ کو بتادوں کہ) ان کو خود بھی پتہ نہیں۔ اِتنا تو میں بھی جانتا ہُوں کہ زبیری صاحب جہاں جائیں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ اگر اپنے ثقافتی رجحانوں کا یہ لفظ ثقیل کے لفظ سے بھی زیادہ ثقیل ہے امید ہے کہ آپ برداشت کرلیں گے اور نہیں کر سکتے تو میرے پاس اور کوئی لفظ نہیں ہے) ہاں میں کہہ رہا تھا کہ زبیری صاحب جہاں جائیں ایک نئی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے ثقافتی میلانوں کا سُدھار اور سِرکار کا پرچار کرتے رہیں اور بیکار سیاسی اُلجھنوں میں نہ پڑیں۔ اِس حد تک تو میں بھی متفق ہوں کہ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اپنے ٹکٹوں کا معائنہ کرکے یہ اطمینان کرلینا چاہیئے کہ جس ڈبے میں سفر کرنا ہے اور جس منزل تک جانا ہے اُس کے لیے ٹکٹ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ سچ پوچھیئے تو میں یہ حد بھی قائم نہ کرتا مگر ہر بات میں حد قائم کرنی چاہیئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ثقافت ہی کی رَو میں بہہ جائیں۔ جیسے ہمارے جج صاحبان اور وُکلاء صاحبان قانون میں بہہ جاتے ہیں اور اصل مقصد قانون کا نہیں دیکھتے کہ عدل اور توازن ہے۔ القصہ آپ زندگی کے عام معاملوں میں بھی عدل اور توازن پیدا کریں اور ایک طرف نہ بہہ جایا کریں مثلاً صرف انگریزی پر ہی زور نہ دیں کہ آنے والی نسل اپنی ثقافت سے بے بہرہ ہو جاتے اور صرف اُردو پر بھی زور نہ دیں کیونکہ یہ انگریزی کی وراثت جو آپ کو ملی ہے بہت قیمتی ہے اور باہر کی دنیا کے ساتھ ربط رکھنے کے لیے یہ ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔ زبیری صاحب جہاں جاتے ہیں وہیں کی کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا کر اُس کو فروغ دیتے ہیں۔ پشاور میں اُنھوں نے اباسین آرٹ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اباسین وہاں کا ایک دریا ہے، پشتو میں اِس کا مطلب ہے دریاؤں کا باپ۔ لوگ اس نام ہی سے اتنے خوش ہُوئے کہ باقی الفاظ جو آرٹ سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے بھُول گئے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اباسین سوسائٹی کو جاکر دیکھوں۔ آخری مرتبہ

پشاور گیا تو معلوم ہوا کہ اُس کی چھت گر گئی ہے۔ آپ دُعا کریں کہ اُردو اکادمی کی چھت تو نہ گرے یا کم از کم اُس وقت تک نہ گرے جب تک میں خطبہ ختم نہ کر لوں یا جب تک زبیری صاحب یہاں رہیں، بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ بالکل ہی نہ گرے اور جب ساری دنیا کو گرنا ہو تو یہ بھی گر جائے کیونکہ "مرگِ انبوہ جشنے دارد"۔ اِسی لیے جب وُزارتیں گریں تو سابق وزیر خوش تھے۔ کہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہوا بلکہ ایک نے تو اُس وقت کے پریذیڈنٹ کو مبارک باد کا ٹیلیفون بھی کیا، یہ اور بات ہے کہ پریذیڈنٹ نے ٹیلیفون نہیں اُٹھایا۔ مَیں نے مضمون یہاں تک لکھا تھا کہ اِس ادارہ کے سیکرٹری سیّد شبیر بخاری تشریف لائے "تاکہ اکادمی کے مقاصد سے مجھے آگاہ کریں۔ اکادمی کا تعارف زبیری صاحب نے بھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے اور ضمناً میں ابھی شبیر بخاری صاحب نے جو باتیں مجھے بتائیں وہ اِس قدر بلیغ تھیں کہ اپنے حافظے پر اعتبار نہ کرتے ہُوئے مجھے ایک کاغذ کے پُرزے پر لکھنی پڑیں اور وہ باتیں اِس امر کے متعلق تھیں کہ بھاولپور کو اُردو کے سبب سے کیا امتیاز حاصل ہے پہلا امتیاز یہ ہے کہ یہاں دفتری زبان ۱۸۴۹ء سے اُردو ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مسل خواں بلکہ مجسٹریٹ اور جج بھی اچھی اُردو لکھ سکتے ہیں چنانچہ مسل خواں حکم لکھ کر حاکم سے دستخط لے لیتا ہے اور حاکم کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اُس نے کیا حکم دیا۔ دوسرے یہ کہ سیّد صفی الدین غزنوی اور پھر جلال الدین حیدر اور پھر قاضی منہاج الدّین سراج اِسی بھاولپور میں آکر اُترے تھے۔ اور منہاج الدین سراج نے نہ صرف طبقاتِ ناصری لکھی بلکہ مدرسہ فیروزیہ دہلی کے ٹرسٹی بھی بنے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب التمش پولو کھیلا کرتا تھا۔ جلال الدین حیدر پہلے پہل اُوچ شریف میں تشریف لائے تھے ورنہ اُوچ 'اُوچ ہی رہتا اور کبھی شریف نہ بنتا۔ گو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رانی اوچاں سے نسبت رکھتا ہے۔ اب مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کون سی

نسبت بہتر ہے۔ اچھا یہ تو ہوئے متقدمین، متاخرین میں سے ارشد گورگانی کا ذکر کیا اور پھر سر عبد القادر کا اور پھر حفیظ جالندھری کا اور بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ نسل کی خاطر میں شبیر بخاری اور مسرت حسین زبیری اور رستم کیانی کا بھی ذکر کر دوں کیونکہ ان تینوں کی مشترکہ مساعی سے آج اُردو اکادمی کا افتتاح ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں زبیری صاحب کا اصرار، میرے بہانے اور اُن بہانوں کا کارگر نہ ہونا یہ ایک لمبی داستان ہے۔

جب میں پچیس اکتوبر گزار کے، جو اکادمی کے افتتاح کے لیئے مقررہ تاریخ تھی، بھاولپور پہنچا تو دیکھا کہ زبیری صاحب بہ نفسِ نفیس اسٹیشن پر موجود تھے وہیں اُنھوں نے یہ خوش خبری سُنائی کہ افتتاح ۲۹ اکتوبر کو ہوگا اور وہ بھی میرے ہاتھوں سے۔ اسٹیشن پر زبیری صاحب اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے آئے تھے۔ کمی صرف یہ تھی کہ بینڈ ساتھ نہیں تھا۔ بینڈ سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے اگلے وقتوں میں اس سے لڑائی کا جوش پیدا کیا کرتے تھے اب شادی کا جوش پیدا کیا جاتا ہے۔ ان ساری باتوں کو دیکھ کر مجھے ننھا یاد آگیا۔ صاحبان! ننھا پاکستان ٹائمز کے اوراق میں ایک فلسفی ہے جو واقعاتِ زمانہ پر طنز و مزاح کے لہجے میں پُر مذاق رائے دیا کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ننھے نے لکھا کہ لاٹ تین قسم کے ہوتے ہیں ایک بڑا لاٹ یعنی پریذیڈنٹ، دوسرا محض لاٹ یعنی گورنر، تیسرا چھوٹا لاٹ یعنی کمشنر۔ مگر زبیری صاحب کے عمل کو دیکھ کر میں تیار ہوں کہ ننھے کی رائے بدل دوں۔ یوں بھی بدلے کے طور پر مجھے کچھ تعریف کرنی چاہیئے۔ کچھ اُردو زبان کی، کچھ زبیری صاحب کی، کچھ اکادمی کی اور ضمناً ایک آدھ لفظ اگر اپنی تعریف میں مُنہ سے نکل جاتے تو آخر میں بھی انسان ہوں۔ زمانے کا کاروبار بھی اس طرح چلتا رہتا ہے اور اردو ادب کی خدمت بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خدمت ہو سکتی ہے کہ پٹھانستان کا ایک باشندہ دریاؤں اور صحراؤں کو تیز گامی سے عبور کر کے ڈانگ کا ر

کے باسی کھانے کی پرواہ نہ کرکے چولستان کے قریب اُردو اکادمی کا افتتاح کرے۔ میرے تو خوشی سے آنسو نکلنے لگے کہ میں اتنی خدمت یا کم از کم اتنی قربانی کے قابل ہوں۔ اِس اکادمی کی قسم مجھے بار بار یاد آنے لگتا ہے جب وہ رانا سانگا سے لڑا تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آرہا ہے جب بابر نے شراب کے پیالے توڑ ڈالے تھے میں بھی ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے مَیں نے ساری پشتو ڈھادی ہو، پٹھانستان توڑ دیا ہو، خوشحال خاں خٹک کو چھوڑ دیا ہو تاکہ اُردو کو فروغ ہو۔ میں نے پٹھانستان کا ذکر اِس لئے نہیں کیا کہ کسی دن آپ کو اردو اکادمی کی ایک شاخ کابل میں کھولنے کا شوق ہو بلکہ اس لیئے کہ ہماری سرزمین کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں کے لوگوں کو اُردو سے ذرا دُور کا تعلق ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ بعض دفعہ وزیر تعلیم ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جن کی علمی استعداد ذرا کم ہو تاکہ وہ اپنی لیاقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے دوسروں کی لیاقت بڑھانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اُردو اکادمی کی صدارت کے لیئے آپ نے مجھے کیوں منتخب کیا ہے۔ مگر اب جو آپ نے مجھے چُنا ہے تو آگ لگے پٹھانستان کو۔

ویسے ہمارے گاؤں میں بھی اردو شاعری کا چرچا رہا ہے دگو آپ تک نہیں پہنچا، سب سے پہلا شاعر میرا ہی ایک بھائی تھا جس نے ایک انگریز خاتون کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا ع

میم صاحب عربی گھوڑے پر سوار

شاعری الفاظ میں نہیں تھی خیال میں تھی۔ گھوڑا اگرچہ ٹٹو رو بریڈ تھا لیکن اُسے عربی کہہ کر شاعر نے افرنگ و عرب کا ناطہ جوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد میرے دو چچازاد بھائی تھے جن میں سے ایک نے وبؔا تخلص کیا اور دوسرے نے مرگؔ۔ اُن کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع

اے مرگِ وبا سے جھگڑا کب تک

یہاں جھگڑا ذرا لمبا ہو گیا ہے ویسے بھی جھگڑے لمبے ہی ہوتے ہیں بہرحال یہ مصرعہ اُس مصرعہ طرح سے کچھ بہتر ہے جو صرف "سڑک" پر مشتمل تھا۔ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کوئی مصرعہ کہو میں اُس پر دوسرا مصرعہ لگا دوں گا۔ دوسرے نے کہا اچھا ع سڑک۔ پہلے نے کہا ع سڑک جو کہ جاتی ہے مکے تڑک۔

دوسرے نے کہا یہ تو غلط ہے۔ یہ مصرعہ تو مصرعہ طرح سے بہت لمبا ہے، اور پھر تڑک کوئی لفظ نہیں ہے۔ پہلے نے جواب دیا جو سڑک مکے تلک جائے گی وہ لمبی ہی ہو گی اور ضرورتِ شعری سے تلک کو تڑک کر دینا جائز ہے۔ شعر اور شاعری کا شوق کچھ اتنا بڑھا کر ہمارے گاؤں کے زمینداروں نے بھی شعر کہنے شروع کر دیئے۔ ایک لڑکا پہاڑ کے قریب بیٹھا تھا دوڑتا ہوا آیا کہ میں نے شعر کہا ہے:

"بیٹھا تھا سرِ راہ کہ گھنٹا گزر گیا"

یہاں بھی گھنٹہ ذرا لمبا ہو گیا ہے مگر گھنٹے ذرا لمبے ہی ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی بڑا حاکم تقریر کرتا ہے اور آپ کو مجبوراً سُننی پڑتی ہے اور آپ دعا کرتے ہیں۔ کہ الٰہی مجھے نیند نہ آئے۔ میں ایسی تقریروں میں اکثر سو جاتا ہوں۔ پھر تالی بجانے کے وقت جاگتا ہوں بلکہ تالی ہی سے جاگتا ہوں۔ اور پھر تالی بھی بجانے لگتا ہوں۔ یہ عادت یعنی سو جانے کی عادت، تالی بجانے کی نہیں، میں کالج کے زمانے سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اس طرح کالج میں بھی وقت اچھا گزرتا تھا۔ اور صحت بھی اچھی رہتی تھی۔ اب آپ میری طرف دیکھیں تو میں آپ کو کمزور نظر آؤں گا۔ یہ صرف ڈائننگ کار کے باسی کھانے کا نتیجہ نہیں ہے بجھے آپ کے غموں نے آدھا کر دیا ہے۔ آپ بیوی کو طلاق دیتے ہیں تو اُسے حق مہر سے بھی محروم کرنا چاہتے ہیں اور کوئی خط اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پیش کر دیتے ہیں جس کی رُو سے وہ اپنے حق مہر سے دستبردار ہو جاتی

ہے اور جو آپ نے کسی ناجائز اثر کے تحت اُس سے حاصل کیا تھا۔ مگر آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے حق مہر کو چھوڑنے پر راضی ہوئی تھی تو اس یقین پر کہ وہ تادمِ حیات آپ کی بیوی رہے گی۔

مضمون قابو سے نکلا جا رہا ہے اور اس میں غم و غصّے کی تلخی پیدا ہو رہی ہے میں کہہ رہا تھا کہ اس لڑکے نے یہ مصرع کہا ع

بیٹھا تھا سرِ راہ کہ گھنٹا گزر گیا

میں نے اس کو داد دی مگر ایک اور لڑکے نے یہ اعتراض کیا کہ گھنٹے کا گزرنا نظر نہیں آتا لہٰذا اس مصرع کو بدل کر یوں کر دینا چاہیے ع

بیٹھا تھا سرِ کوہ کہ کوّا گزر گیا

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب انتخابات نہیں ہوا کرتے تھے۔ دیہات میں بھی اور پہاڑوں پر بھی لوگ شعر کہا کرتے تھے۔ پھر انتخابات آ گئے تو لوگ سیاست میں مُبتلا ہو گئے۔ شاعری ختم ہوئی۔ اب میں پھر اُمید کرنے لگا ہوں کہ کچھ ہو گا۔ اور کچھ نہیں تو اُردو اکادمی بہاولپور کے حالات پڑھتے رہیں گے۔

میں نے یہاں آتے ہی پُوچھا تھا کہ یہ اکادمی کیا بلا ہے۔ سیکرٹری صاحب کو بھی احساس تھا کہ یہ لفظ میری بساط سے باہر ہے۔ اُنھوں نے مہربانی فرما کر توضیح کی اور کہا کہ یہ انگریزی لفظ اکیڈیمی کی تعریب ہے۔ اب اگر تعریف کا لفظ اکادمی سے کم ثقیل ہو تو آپ مجھے جو جاہیں سزا دیں تعریب سے مطلب عربی کارنگ دینا ہے۔ عملِ تعریب کی وضاحت کرتے ہوئے سیکرٹری صاحب نے کہا کہ پوٹیٹو (POTATO) کا لفظ مصر میں بتاتا ہو گیا۔ میں نے پُوچھا کہ آلو کیوں نہیں بنا۔ جواب دیا کہ مصر میں آلو کینیڈا سے آتے ہیں اس لیے انگریزی نام کی تعریب ہوئی۔ گویا یہاں بھی ہم پیچھے ہی ہے۔ اگر آلو بھیج سکتے تو کم از کم آلو کا نام ہی بھیج دیا ہوتا۔

مگر میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ تعریب ہے یا تفریس۔ میں یہ پُوچھ رہا تھا کہ اکادمی ہے کیا چیز؟ اِس پر سیکرٹری صاحب نے دستورالعمل کی ایک نقل دی جس کی دفعہ ایک میں لکھا ہے کہ اُردو زبان کے تحفظ و تحقیق و فروغ و اشاعت کا نام ہے اُردو اکادمی۔ یہ دستورالعمل پڑھ کر تو مَیں سر سے پاؤں تک مُعرّب ہو گیا۔ جسم سے عربی ٹپکنے لگی۔ قرآن شریف بھی بھول گیا۔ قرآن کے آسان جُملے تھے مثلاً "کانَ مِنَ الْکافِرِیْنَ" یعنی سالے کانے کافر ہوتے ہیں۔ یا پھر "خرّ مُوسیٰ صاعِقاً" یعنی موسیٰ کا گدھا گر پڑا، اور کسی نے کہا یہ کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ہم تو خرِ عیسیٰ کا نام سنتے آتے ہیں۔ خرِ مُوسیٰ کبھی نہیں سُنا۔ میرے وہ بھائی جنہوں نے میم صاحب کو عربی گھوڑے پر سوار کیا تھا، اگر یہ دستورُالعمل پڑھتے تو بے ساختہ کہتے کہ اُردو اکادمی عربی گھوڑے پر سوار ہے۔ اب ذرا سُنیئے دفعہ ۳۔

"اُردو اکادمی، تاریخ و ثقافت، زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون کے فروغ و ارتقا کے لئے ترجمہ و تالیف اور تحقیق و تصنیف کے مختلف شعبے قائم کرے گی۔

"اُردو کے معیاری کُتب کے تراجم کا دُوسری زبان میں بندوبست کرے گی تاکہ بین الاقوامی افکار و معارف سے اُردو زبان و ادب متعارف ہو سکیں۔" اور سُنیئے "اُردو یونیورسٹی کے قیام کے تخیل کو بتدریج جامۂ عمل پہنانے کی کوشش کرے گی۔" یہ جامۂ عمل اچھا رہا۔ گویا جامۂ عمل اُردو اکے عمل کا جامہ اُس کو پہنائیں گے۔ یہ کوئی بڑا سا اوور کوٹ ہوگا۔ کیوں نہ ہو افتتاح جو جامعہ عباسیہ میں ہو رہا ہے۔ مگر ان جُملوں میں سے آپ حروف جار اور "کرے گی" کے الفاظ نکال دیں تو باقی جو کچھ رہ جائے گا۔ وُہ اُردو اکادمی ہو گی۔ دستورُالعمل دیکھ کر غالبؔ کے مقدّس کلام کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اُنھوں نے اپنے اس مشہور شعر میں اُردو اکادمی کے قیام کی تاریخ کہی تھی۔

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا　　　　تماشائے بیک کف بُردن صد دل پسند آیا

غالب خوش قسمت تھے کہ اُنھیں ہمدرد شارحین مل گئے۔ ایک پٹھان نے رس نے بھی اِس قسم کے کچھ معرّب اور مفرّس شعر پشتو میں کہے تھے۔ جب اُس نے ایک پٹھان دیہاتی کو سُنائے تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس نے پُوچھا "یہ کس کے شعر ہیں" جواب دیا "حقیر کے" اُس نے کہا "خدا تجھے اور حقیر کرے۔ یہ پشتو ہے یا قرآن شریف" البتہ جو قواعد و ضوابط صاحب صدر کی طرف سے زیرِ دفعہ ۹ بنے ہیں۔ وہ کچھ اچھے ہیں مثلاً

"دفعہ ایک (الف) اِن قواعد کا نام اُردو اکادمی رولز ۱۹۵۹ء ہوگا"

(ب) "یہ قواعد فوراً نافذالعمل ہوں گے بجز اس کے کہ مضمون یا سباق کے اعتبار سے کوئی امر اس کے مغائر ہو"

میں ہوتا تو یُوں لکھتا "بجز اُنکہ بہ اعتبارِ مضمون یا سباق مغائراں بود"

لیجیے میں بیٹھتا ہُوں تاکہ سیکرٹری صاحب زیادہ ناراض نہ ہوں۔ مگر آپ کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ میں اُردو کی خدمت کر رہا ہُوں۔ ورنہ نہ جانے آپ اِس کو کتنی غیر زبانوں کے سینگ لگائیں گے۔ یہ تو پہلے ہی بارہ سینگا ہے۔ مگر ختم کرنے سے پیشتر ایک غلط فہمی دُور کر دینا چاہتا ہُوں۔

یہ پہلا موقعہ نہیں کہ میں سُن رہا ہُوں کہ جسٹس رحمٰن نے مجھے وراثت منصبی میں کچھ دیا ہے۔ اُردو نظم اور فارسی کے ترجمے اور علم و ادب سب وہ ساتھ لے گئے ہیں اور آج میں اعلان کرتا ہُوں کہ اُنھوں نے میرے پاس سوائے ایک چاندی کے گرز کے اور کچھ نہیں چھوڑا اور وہ گرز نہ تو وہ اٹھا سکتے تھے اور نہ میں اُٹھا سکتا ہوں البتہ ایک مرثیہ اُنھوں نے چھوڑا ہے اور وہ بھی میرے مرنے پر لکھا تھا یہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے جب ہم ولایت میں تھے میں سُنا دیتا ہُوں تاکہ آئندہ وہ کسی اور چیز

کا دعوٰی نہ کر بیٹھیں۔

سوچتا تھا کدھر گیا رُستم
آئی آواز مر گیا رُستم
اک کیانی جہاں میں تھا موجُود
ہائے اب وُہ بھی ہو گیا مفقوُد
علم و آداب میں یگانہ تھا
اُس کا ہر قول تازیانہ تھا
اس پہ طرّہ کہ فیلسوف بھی تھا
گرچہ تھوڑا سا بے وقوف بھی تھا
حسُن کی شمع کا تھا وُہ شیدائی
عشق تھا اُس کا آرٹ آبائی
ناک بھی اُس کی تھی اچنبھا سی
لگ گیا ہاتھ گر تو بہنے لگی!
اللہ بخشے اُسے عجیب تھا وُہ
رہتا گھر سے میرے قریب تھا وُہ
جب کبھی یاد اُس کی آئے گی   اُس کی شوخی مجھے ستائیگی

زبانِ یارِ من تُرکی و من تُرکی نمی دانم

حضرات! ادو ڈھائی سال ہوئے مجھے میرے شفیق دوست مکرّت حسین زبیری نے، جو اُس وقت بہاولپور میں کمشنر تھے، بہاولپور اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر بلایا تھا اور اس وقت مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب چونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اس لیے اکیڈمی کو اکادمی اور ہندوستان کو بھارت کہنے لگے ہیں۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ غالباً "اکادمی" کا میڈم سے کوئی رشتہ ہے جو فرنچ میں مدام پڑھا جاتا ہے اور مدام ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے یا شاید صحیح اردو میں کھینچتی ہے۔ نہ معلوم یہ مذکر مونث کے صیغے کب میری سمجھ میں آئیں گے۔ ویسے دیکھ کر تو میں مذکر اور مونث کی تمیز کر لیتا ہوں چنانچہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں میرے سامنے اس وقت حضرات ہی حضرات ہیں۔ حاضرات کوئی نہیں۔ یہاں پھر ایک مشکل پیدا ہو گئی ہے۔ میں تو حاضرات کو مستورات کے وزن پر استعمال کر رہا تھا۔ مگر فیروز اللغات سے، جو مذکر و مونث کے جھگڑوں میں میرے لیے رہنما ہے، معلوم ہوا کہ حاضرات اُس جلسے کو کہتے ہیں جس میں جن بھوت جمع کیے جائیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ جن بھوت ہوں مگر خدا ایسا تو کرتا ہے کہ ہم آپ جیسے ہی لوگوں میں سے جن بھوت پیدا کر دیتا ہے دنیا میں جو سرکشی کرے اُس کو جن کہتے ہیں۔ جو کسی سرکش کے سر پر سوار ہو جائے اُس

کو بھوت کہتے ہیں اور جو بھوتوں کے بھی سر پہ سوار ہو جائے اُسے بھوت ناتھ کہتے ہیں۔ اِس اعتبار سے اگر آپ حضرات ہی رہیں تو بہتر ہے۔ زیادہ سے زیادہ غلطی یہی ہو سکتی ہے کہ حضرات کو حسرات پڑھا جاتے، یعنی حسرتوں کی جمع اور حسرتیں بھی میری جو جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ کہیں اُن غنچوں پر جو بِن کِھلے مُرجھا جاتے ہیں۔ مُرجھاتے کیا ہیں جنھیں کِھلنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ کہیں: کسی ایسی اکیڈمی میں جو بھاولپور پہنچ کر اکادمی بن جاتی ہے اور ملتان میں اِکادمی۔ زبر اور زیر کے فرق سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس اکادمی کا چلانے والا ایک آدمی ہوگا۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ وُہ آدمی ہیں آغا شبیر احمد خاں المعروف بہ خموش، جو بعض مقام پر اپنا نام راقم الحروف بھی لکھتے ہیں اور اکثر خموشی سے اکادمی کی روئداد لکھتے ہُوئے اردو زبان کا مرثیہ بھی لکھ دیتے ہیں۔— بھاولپور میں تو اس وقت کے سیکرٹری شبیر بخاری نے صاف گوئی سے کہا تھا کہ یہ اُردو اکادمی ہے مگر یہاں ملتان میں اُردو کا لفظ کسی مصلحت سے استعمال نہیں کیا گیا۔ ایک تو آغا شبیر احمد خاں فارسی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے اُردو کے لفظ کے نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر وُہ اِکادمی کی کارروائی فارسی میں بھی لکھ دیں تو کوئی معترض نہیں ہو سکتا۔ ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے کہ "اِکادمی کے گزشتہ سال کی روئداد اِکادمی کی اپنی زبان میں ہوتی تو اِکادمی کو ایک گُونہ مُسرّت حاصل ہوتی۔" میں سوچتا رہا کہ اِکادمی کی اپنی زبان کون سی ہے۔ ملتانی تو نہیں؟ اگر ہے تو میں مُلتانی زبان بھی جانتا ہوں اور اُس کا ایک فقرہ، جو تیس سال ہُوئے گانے کی ایک محفل میں سنا تھا، اب تک یاد ہے "سائیں پھر نہ مل سو؟" جس کا مطلب میں یہ سمجھا تھا کہ کیا آئندہ پھر کبھی ہم نہیں ملیں گے؟ ہم نے جواب دیا "کیوں نہ ملسو" اور حاضرین اور خصوصاً حاضرات نے ہماری ملتانی کو پسند کیا تھا۔ بہر حال ہم نے "کیوں نہ ملسو" کا وعدہ آج تیس سال بعد پُورا کیا ہے لیکن افسوس صرف اتنا ہے کہ یہ وعدہ گانے کی محفل میں پُورا نہیں ہُوا معلوم نہیں

ملتان اکادمی گانے کو جائز سمجھتی ہے یا نہیں۔ پاکستان آرٹ کونسل میں تو ہم گانا بھی جائز سمجھتے ہیں اور بجانا بھی۔ بلکہ تیسری چیز یعنی ناچ کو بھی جو اِن دونوں سے بہتر ہے۔ بہت سی چیزوں کو آپ مکان و زمان کے اعتبار سے ناجائز بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر گانے اور ناچنے کو محفل رقص و سرود کہا جائے اور اُس کا افتتاح کسی معتبر آدمی سے کرایا جائے اور وہ بازار کے بالا خانے کی بجائے کسی بنگلے میں ہو تو اُسے آرٹ کہتے ہیں اور اُس کا شمار فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک سرکاری ملازم کے خلاف یہ جرم قائم ہوا کہ اُس نے ایک گانے والی عورت کو کچھ زمین دلوائی تھی۔ اس نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ تو آرٹسٹ ہے۔ جس زمین کی خرید و فروخت پر یہ تنازع پیدا ہوا تھا اُسے بھلا کر بحث اِس بات پر شروع ہو گئی کہ خریدنے والی آرٹسٹ ہے یا محض گانے والی۔ چونکہ سرکار کا پلّہ بھاری تھا وہ آرٹسٹ گانے والی ہی رہی۔ مگر کیا کوئی گانے والی قیمت دے کر بھی زمین نہیں خرید سکتی؟ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بے چاری آسمان سے بھی محروم رہے اور زمین سے بھی۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ اکادمی کی اپنی زبان کون سی ہے اور خوش صاحب کیوں اس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں میری نظر سے اُن کی وہ رپورٹ گزری جو انھوں نے ممبران اکادمی کو ۱۹۵۵ء میں پیش کی تھی۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:۔

> "علم، ادب اور فن کے بیشتے صحیح ذوق اور فکر کی ترویج اور تربیت اُردو زبان کے علمی اور ادبی ذخائر میں عصرِ حاضر کے صحت مند تقاضوں کے مطابق مفید افکار کا اضافہ اور شعر و ادب کے لیے پاکیزہ ذوق کی اشاعت اور علم، ادب اور فن کے ذریعے مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوق خدمت کی پرورش، یہ تھے وُہ عزائم جو ملتان اکادمی نے اپنے لیے قبول کیے۔"

آپ نے کبھی سُنا ہے "قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند"

حضرات! یہ پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ ملتان اکادمی کا ہاضمہ بہت اچھا ہے اگر یہ فارسی کے الفاظ جو حضرت "راقم الحروف" نے ۱۹۵۵ء میں استعمال کیے تھے، آپ نے سات سال میں ہضم کر لیے ہوتے تو اب تک آپ کابل پہنچ گئے ہوتے۔ بہر حال میں خدا کا اور اپنے سکول کے مولوی صاحب کا شکر بجا لایا کہ انھوں نے اردو گرامر کے پڑھنے کی توفیق دی اور حروف جار پر خاص زور دیا۔ اگر آپ کے مولوی صاحب نے بھی آپ کو ایسی کسی مفید بات سے آگاہ کیا ہو تو بہ تحقیق آپ کو معلوم ہو گا کہ کا، کے، کی، حروفِ جار ہیں اور خموش صاحب کے اِس مختصر کلام میں جو میں نے ابھی پڑھا ہے گیارہ مقام پر استعمال ہوئے ہیں۔ خوشا حروفِ جار! اگر یہ ملتان میں نہ ہوتے تو ہم کیسے پتہ لگا سکتے کہ خموش صاحب اُردو بول رہے ہیں یا فارسی۔

بہر حال چونکہ ملتان اکادمی کو سیکرٹری صاحب کے الفاظ میں علم و ادب اور فن کے لیے صحیح ذوق اور فکر کی ترویج اور تربیت کرنی ہے۔ اِس لیے وہ آموں اور کھجوروں کا ذکر تو نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ آموں اور کھجوروں کے کھانے کے لیے صحیح ذوق پیدا کرنا بھی (میں پھر اُن ہی کے الفاظ استعمال کرتا ہوں) مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوقِ خدمت کی پرورش کے برابر ہے کیونکہ آموں اور کھجوروں کی گٹھلیاں بھی ہوتی ہیں، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کو کہاں پھینکا جائے۔ پچھلے یوم پاکستان کے موقعہ پر گورنمنٹ ہاؤس کی عصرانہ پارٹی میں یہ مشکل پیش آئی۔ وہاں سنگترے، مالٹے سیب اور شاید کیلے بھی تھے۔ حضور! میں نے چائے کے ساتھ اگر کسی کے اصرار پر ایک آدھ کیلا اِس نظریے سے کھایا ہو کہ پیٹ کے لیے اچھا ہے تو کھایا ہو گا، مگر سنگترے، مالٹے اور سیب کو چائے کے موقعہ پر کھانا چائے کی بھی بے عزتی کرنا ہے اور پھل کی بھی۔ لیکن اگر گورنمنٹ ہاؤس میں کھانے کی بجائے اپنی جیبوں میں گھر

لے جائیں۔ بلکہ اِس سلسلے میں ایک آرڈی ننس جاری کر دیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ آرڈی ننس کے بغیر ہم خود کوئی کارِ ثواب نہیں کرتے۔ اب یومِ پاکستان کا سنیئے۔

اُس دن صبح کو میں نے قائدِ اعظم سوسائٹی کے ایک جلسے میں پوچھا تھا کہ شام کو جب آپ گھر واپس جائیں اور بیوی پُوچھے کہ آپ نے پاکستان کے لیے آج کیا کیا ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟ میری تقریر کا کبھی اتنا گہرا اور فوری اثر نہیں ہوا جتنا اُس دن ہوا کیونکہ ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ گورنمنٹ ہاؤس کے مخملیں سبزہ زاروں پر پھلکوں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے تھے۔ سنگتروں اور مالٹوں کے کُشتوں کے پُشتے لگ گئے تھے۔ ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی پلیٹ میں جو ایک ہی پھل کی حامل ہو سکتی تھی ایک عدد سنگترہ، ایک عدد مالٹا اور ایک عدد سیب لے کر نکلا۔ ہجوم سے نکل کر جب اُس نے مجھے کھڑا پایا تو جھٹ کہا "یہ آپ کے لیئے لے آیا ہُوں۔" پھر اُسے خیال آیا کہ کہیں میں تینوں تو نہ اُٹھا لوں۔ تشریحاً کہا "جو آپ کو پسند ہو لے لیں" مزید تشریح کے طور پر کہا "مجھے آپ کی تقریر بہت پسند آئی۔" میں اپنی غلطی کو سمجھ گیا وہ شام کو جا کر بیوی سے کہے گا کہ پاکستان کے لیئے میں نے سرکاری خرچ پر سیب مالٹے اور سنگترے کھائے ہیں۔ اِس کے علاوہ سرکاری خرچ پر سٹاف کاروں میں پھرا ہُوں، ٹیلیفون بھی کیئے ہیں اور شکار بھی کھیلا ہے۔ اگر بیوی پُوچھے کہ شکار کے دن کیا چھُٹی تھی تو کہے گا کہ تھوڑا سا کام بھی رکھا تھا مگر چُونکہ کاغذات نہیں پہنچے تھے اس لیے اگلے مہینے پھر جاؤں گا، جب تک مُرغابیاں بھی وسطِ ایشیا کی طرف سے آ چکی ہوں گی۔ خیر یہ ٹیلیفون اور سٹاف کار اور شکار تو پہلے بھی تھے مگر آج کی تقریر کا مجھ پر اتنا اثر ہُوا کہ میں نے سوچا اپنے مُردہ جسم کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری پھل بھی کھاؤں تا کہ پاکستان کی خدمت زیادہ مستعدی سے کر سکُوں۔ لان کے وسط میں مجھے مظفر احمد ملے جو میری طرح تنہا کسی غم میں مبتلا نظر آتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انُھوں نے پُچھکوں

کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اگلے سال سے یہ بند ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے یہ سُن کر میں نے غیر شعوری طور پر خموش صاحب کے الفاظ میں کچھ اس طرح کی بات کہی ہو "یہ لوگ مملکت اور معاشرہ کے لیے ذوقِ خدمت کی پرورش کر رہے ہیں اور علمِ خوردن و زیستن یعنی کھانے اور جینے کے علم کو ترویج دینے کے لیے صحیح ذوق اور فکر کی تربیت میں مصروف ہیں" اور اس کے علاوہ خموش صاحب کے صحیح ذوق کو چھوڑ کر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ جہاں گُل ہیں وہاں خار بھی ہیں اور جہاں مالٹا ہے وہاں چھلکا بھی ہے۔ مظفر احمد نے کہا "یہ صرف سنگترے اور مالٹے کی ہی بدقسمتی نہیں۔ یہ لوگ ہر چیز کی طرف حریصانہ لپکتے ہیں۔ پچھلے دنوں مسز کینیڈی جب شالیمار میں . . . . . . فقرہ نامکمل رہ گیا کیونکہ اتنے میں گورنر صاحب تشریف لائے اور سب اُدھر لپکے۔ البتہ کوئی منچلا غالب کا ایک مصرعہ ذرا سی تحریف کے ساتھ پڑھتا ہوا میرے پاس سے گزرا۔ ع

دامن کو آج اُس کے حریصانہ کھینچیے

اب اگر گورنر صاحب سو گز کے فاصلے پر بھی ہوں تو یہ لوگ سیدھے اُن کی طرف لپکتے ہیں اور اس صراطِ مستقیم میں اگر کوئی چیز از قسمِ انسان حائل ہو تو اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور اگر وُہ چیز خود راستے سے نہ ہٹے تو اُسے پامال کر دیتے ہیں۔ اکثر تو وُہ چیز خُود بھی اُسی طرف لپکتی ہے اس لیئے پامال ہونے کا خطرہ کم رہ جاتا ہے میں پائمالی کے خوف سے اِدھر اُدھر بچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خود گورنر صاحب کی مجھ پر نظر پڑی اور نظر بھی، اس لیے پڑی کہ اُن کا قد اونچا ہے۔ اونچے قد اور اونچے مقام کا یہ بڑا فائدہ ہے کہ زندگی کی پستیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس لحاظ سے میرا قد بھی مفید رہا کیونکہ جہاں ہر طرف بلندی ہو تو وہاں ایک چھوٹی سی پستی زیادہ جاذبِ توجہ ہو جاتی ہے۔ خیر جب گورنر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی تو انھوں نے مجھے اپنی کشادہ بغل میں پناہ دی۔ لوگ پھر لپکے اور ایک نئی موج کے تھپیڑے نے مجھے اُن سے علیٰحدہ کر دیا۔ بعد میں معلوم

ہُوا کہ وُہ مجھے ڈھونڈنے کے لیے۔ مگر میری لاش کنارے پر پہنچ چکی تھی اور میں اُسے نظر بچا کر گھر لے گیا۔

اب میرا خیال ہے کہ یہ چھلکوں والا مضمون چھوڑ دینا چاہیئے اور بس یہ آخری چھلکا پھینک کر چھوڑ دیتا ہُوں اور وُہ یہ ہے کہ ملتان اکادمی کو خیال تھا کہ میں لاہور سے اپنے ساتھ پھل لاؤں گا مگر اب تک تو میں نے چھلکے ہی دیے ہیں۔ ممکن ہے اِس کا سبب یہ ہو کہ اہلِ ملتان کے بارے میں کچھ عجیب قسم کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ مثلاً میں نے یہ سنا ہے کہ یہاں اگر کسی مشہور باغ کے مالک کے گھر جائیں اور وہ آم کھلانے پر راضی بھی ہو جائے تو گٹھلیاں تھیلے میں جمع کرتا جاتا ہے تاکہ اور کوئی اُن کو کاشت کر کے اُس قسم کا آم پیدا نہ کرے اور وہ تھیلا دریا میں پھینک دیتا ہے جس طرح گنگا میں لاش کے پھول پھینکا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خوش صاحب نے بھی رابندر ناتھ کے اِس اندازِ تواضع کو اپنا لیا ہے۔ جب اکادمی آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے کوئی جلسہ کرتی ہے تو اُس کی روئیداد سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے آم کی گٹھلیاں تھیلے میں جمع کی جا رہی ہوں۔ الفاظ کی گونج آپ کے کانوں میں رہ جاتی ہے۔ مطلب اکادمی کے کارکن سمیٹ کے لے جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس شہر میں آم کے متعلق ایسی روایات موجود ہوں وہاں کیوں ابھی تک وہی پُرانے چار تحفے مشہور ہیں: "گرد، گرما، گدا و گورستان" گرد و گرما کہاں نہیں اور گداگری تو ہماری سرشت میں ہے۔ گدا اگر بھی تیار کھانا مانگتا ہے اور ہم بھی تیار چیز مانگتے ہیں جو محنت کے بغیر حاصل ہو۔ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫ خدا نے انسان کو بہترین فطرت دے کر پیدا کیا یعنی ایک ایسی فطرت دے کر جو سوچنے سمجھنے پر مائل ہے۔ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ پھر اُس کو پیٹ دے کر پست کر دیا اور وُہ بھیک مانگتا ہے۔ کبھی اکیلے فقیر کی صورت میں، کبھی قومی حیثیت میں دوسری قوموں سے۔ اقبال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ خراج

مانگنے والے بھی فقیر ہوتے ہیں

کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

البتہ ملتان کے جو تحفے کے بارے میں یہ بات درست ہے کہ جب ہم لاہور کی طرف سے شہر میں داخل ہوتے تھے تو سب سے پہلے قبرستان نظر آتا تھا اگر جہاں پہلے چھوٹا قبرستان ہوتا تھا وہاں اب کیلوں کی کالونی ہے اور جب میں ادھر سے گزرتا ہوں تو یہی خیال دل میں آتا ہے کہ افسروں کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ قبرستان میں ہی افسری کریں۔ کیا ان کی نوکریوں میں کافی قبریں نہیں کھودی گئیں۔ کیا چار پانچ سال کے بعد اُن کو ایک نئی قبر کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔؟

مطلب یہ کہ میں ملتان سے کافی واقف ہوں اور اگرچہ میرے پاس تعارف ملتان پر شیخ اکرام الحق صاحب کی وہ تقریر جو انھوں نے پرفسور آغا حسن سید نفیسی کے آنے پر پرفسوں فارسی میں کی تھی پہنچی ہے۔ لیکن مجھے آپ آغائے نفیسی کی طرح محض کھانوں پر اور ایسے شعروں پر نہیں ٹال سکتے کہ ؎

چہار چیز است تحفۂ ملتان

گرد، گرما، گدا و گورستان

اُن کو آپ نے گرمی اور گداگری سے ایسا ڈرایا کہ اب چھ سال ہوئے کسی ایرانی نے یہاں آنے کا نام نہیں لیا۔ مگر آج جس نیم پختہ ایرانی کو آپ نے بلایا ہے وہ آپ کے گرد اچھی طرح سے جانتا ہے اُس کو یہ بھی معلوم ہے کہ آموں کے علاوہ یہاں کا سوہن حلوہ بھی مشہور رہے جس کے بیشتر حقوق بحق مخدوم صاحبان محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ کم از کم ایک مخدوم تو میرے پاس ہر سال نذر کا کچھ حصہ بھیجتے ہیں۔ میں اُن کا نام نہیں لیتا، مبادا نذر بھیجنا بند کردیں۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب اُن کے مُریدوں کے ضعفِ اعتقاد کے سبب نذروں میں کمی ہو جاتے تو وہ

سوہن حلوہ بازار سے خرید کر بھیج دیتے ہیں اور بازاری چیز کھانے سے میرا عقیدہ اور گلا دونوں خراب ہو جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ "ایک چیز دیگر است کر آں را خرما گویند" جس کا علم مجھے تعارف نامے سے ہوا ممکن ہے ملتان اکادمی کے احاطے میں دہب دہ بن جائے کھجور کے درخت بھی ہوں۔

ان چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے میں نے ملتان کا آئین بدل دیا ہے اور اے ملتان والو! بہ تحقیق جان لو کہ تمہاری اُن خدمتوں کے صلے میں جو تم نے محمد بن قاسم کے زمنت میں کی تھیں تم کو جو چار تحفے دیئے گئے تھے وہ اب یوں پڑھے جائینگے:

چار چیز است تحفۂ ملتان

اَم و مخدوم و حلوہ و خرما

لیکن آپ اگر قافیے کا لحاظ رکھتے ہوئے کھجور کو نظر انداز کریں تو ـــــ میں نے بہت سوچا مگر ملتان کا قافیہ شیطان کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، جو اپنی جگہ بُرا بھی نہیں ہے شیطان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور کس کے ساتھ نہیں ہے؟ اگر ملتان کو ایک علیحدہ شیطان دے دیا جائے تو اس کا مستحق ہے کیونکہ یہاں شیطان ہی کی کمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شیطانی ملتان والوں کی یہ ہے کہ ایک آدھ مجرا کرا لیتے ہیں اور کسی سے کہلوا لیتے ہیں سائیں! اچھرہ ملسوہ مگر شریف اتنے ہیں کہ محمد بن قاسم صاحب تئیس من سونا اور تیرہ ہزار دو سو من خاک طلا لے گئے اور شیخ اکرام الحق صاحب آج بھی ان کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ یہ سونا محمد بن قاسم نے خود استعمال نہیں کیا تھا بلکہ بیت المال کے لیے بھیجا تھا کیونکہ وہاں خرچ بہت بڑھ گئے تھے۔ اور آپ جو کچھ کہیں حساب کتاب وہ ٹھیک رکھتے تھے ورنہ تیرہ ہزار دو سو من خاک طلا تولنا بھی کانی جفاکشی کا کام ہے۔ عمر خیام نے رباعیات ملتان میں لکھا ہے کہ جس مندر سے یہ سونا برآمد ہوا تھا اُسی کے پجاریوں سے تلوایا بھی گیا تھا اور ان کو ایک

ماشہ فی من مزدوری کے علاوہ رسید بھی لکھ دی تھی تاکہ سند رہے۔ یہ رسید تقسیمِ ہندوستان کے وقت اہلِ ہنود ساتھ لے گئے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ رسید کسی طرح کسٹوڈین کے ہاتھ لگ گئی ہے اور وہ ہندوستان سے خط و کتابت کر رہا ہے۔

رباعیاتِ ملتان جو عمر خیام نے لکھی ہیں شاید شیخ اکرام الحق صاحب کی نظر سے نہیں گزریں ورنہ وہ تعارف نامے میں یہ واقعات ضرور بیان کرتے۔ اس کے علاوہ اور تمام باتیں صحیح ہیں، مگر چونکہ اُن کا مضمون فارسی زبان میں ہے ممکن ہے آپ سب نے نہ پڑھا ہو، اس لیے چند کام کی باتیں بتا دیتا ہوں۔ جب محمد بن قاسم کے کافی عرصے کے بعد اُن کھجوروں کی گٹھلیوں سے جو اُن کی فوج عرب سے زادِ راہ کے طور پر لائی تھی، نخلستان بن گئے تھے تو رضیہ سلطانہ کو ان نخلستانوں کو دیکھنے کا شوق ہوا اور اُس نے ملتان آنے کا ایک معقول سیاسی سبب تلاش کیا۔ چنانچہ بقول صاحبِ تعارف نامہ اُس کی آمد بتقریب "ادب حاکم ملتان" تھی یعنی ملتان کے حاکم کو ادب سکھانے کی تقریب میں۔ یہ نہیں لکھا کہ اُس زمانے میں ملتان کا حاکم کمشنر ہوتا تھا یا ڈپٹی کمشنر۔ مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ حاکموں کو ادب سکھانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور اس سلسلے میں تقریبیں منعقد کی جاتی تھیں۔

اس کے بعد امیر خسرو آئے اور پانچ سال ملتان میں رہے اور شاید زیادہ دیر رہتے، مگر لوگوں نے تنگ آ کر اُن کے سر پر آموں کی ٹوکری رکھ دی اور کہا "چل" یعنی چلتے بنو۔ وہ بیچارے یہ شعر پڑھ کے چلے گئے۔

من کہ بر سر نمی نہادم گل
بار بر سر نہاد و گفتنا چل

اس کے بعد ہمایوں کا گزر ہوا جو ہما کی تلاش میں تیزی سے ملتان کے راستے ایران چلا گیا۔

اس کے بعد ملتان کا صوبہ شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد ہوا جو ایک دیندار حاکم تھا، اور چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھتا تھا، اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد لغاری صاحب مشتہر ہو کر آئے جو اورنگ زیب کے علاوہ مجھ پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے عقیدوں کی وجہ سے تکلیف میں رہتے ہیں مگر شاید اس سے پہلے آغا شیر احمد خاں نمرش وارد ہوئے۔ اور بقول صاحب تعارف نامہ تاسیس انجمن ہائے کبیر مثل ملتان اکادمی نہاد ”یعنی ملتان کو چھوڑ کر کبیر والا کے قریب اکادمی کی بنیاد ڈالی۔ السبی بڑی بنیادیں شہروں سے دُور ڈالی جاتی ہیں۔ مثلاً اسلام آباد اور آفیسرز کالونی۔ اکادمی کی بنیاد پڑنے کے بعد بات پوری ہو جاتی ہے لیکن اگر آپ تعارف نامے کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں تو لکھ دیں کہ آغا نے تفتیشی کے ٹھیک چھ سال بعد ایک نیم پختہ ایرانی المعروف بہ رستم طبقائی بتقریب تادیب اکادمی ملتان آئے تھے۔ رستم کے نام سے مجھے ایک دو قصے یاد آئے ہیں شاید آج کی تقریر میں آپ کو بھی پسند آئیں۔ اگر پسند نہ آئیں تو کم از کم بعض احباب کا تقاضا پورا ہو جائے گا جو ڈیلسٹوئونک کے وزن پر پوچھتے ہیں کہ میرا اصلی نام کیا ہے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک زیں جماعت کے طالب علم نے مجھے خط لکھا کہ جب بھی آپ کی تقریر اخبار میں آتی ہے تو ہمارے گھر میں اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے۔ یہ ایم آر کیانی تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کبھی ہم محمد رمضان سمجھتے ہیں کبھی ملک نجیبت۔ آپ اپنے ہاتھ سے لکھیں کہ آپ کا اصلی نام کیا ہے تاکہ ہمیشہ ہمارے گھر میں آئندہ یہ جھگڑا نہ ہو۔

میں نے جواب دیا کہ یہ خط میں اپنے ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور میرا نام محمد رستم ہے اور جو اس کے بعد شک کرے وہ کافر ہے۔ نیز چونکہ اس کا احتمال ہے کہ اس کے بعد آپ کے گھر میں میرے قد و قامت پر جھگڑا اُٹھے تو واضح ہو کہ میں خود تو بال سے زیادہ باریک ہوں مگر میری ہڈیاں تلوار سے زیادہ تیز ہیں جن پر دو غلی باتوں کے ٹرک

نہیں گزر سکتے اور اے برخوردار! اپنے گھر والوں سے کہو کہ اگر کبھی جمعۃ الوداع کی نماز پڑھیں تو سمجھ لیں کہ "اھدنا الصراط المستقیم" کے یہی معنی ہیں۔ کوئی سچ مچ ایسا پُل نہیں ہے جو تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں نے تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ بس یہ بھی اِس قسم کا پُل ہے۔ صرف اس میں تعریفیں نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی تیز دھار لوہا ہے۔ اُس برخوردار نے لکھا کہ یہ باتیں تو میں نہیں سمجھتا، بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنی تصویر بھیج دیں۔ تصویر تو میں نے ابھی نہیں بھیجی مگر اُس لڑکے کی یہ بات کہ محض ایم۔ آر کیانی کچھ معنی نہیں رکھتا، ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں کہ سچی ثابت ہوئی آپ کو معلوم ہوگا "WHO IS WHO" کے نام سے بعض پبلشر ایک ڈائرکٹری چھاپتے ہیں جس میں بقول اُن کے مشہور لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ بات مسلمہ ہے کہ وزیر تو مشہور ہوتے ہی ہیں جج بھی مشاہیر میں سے ہیں اور اگر وہ تصویر کے ساتھ روپے بھی بھیج دیں تو مزید شہرت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ پچھلے ہفتے اپنی ہسٹری شیٹ کی تصحیح کے لیے میرے پاس انگلستان سے ایک خط آیا۔ ہسٹری شیٹ میں میرا نام ملک رحمٰن کیانی ورج تھا، جو میرے بڑے بھائی کا نام ہے، وہ بھی ایم۔ آر کیانی ہیں۔ اُن کے دو لڑکے بھی ایم۔ آر کیانی ہیں۔ ہسٹری شیٹ میں میری سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تھا اور یہ بھی کہ فلاں سال میں میں صوبہ سرحد میں وزیر صحت ہوا جس سے صحت کچھ اچھی ہوگئی مگر ۱۹۵۵ء میں وزیر مواصلات ہوا اور پھر سارے وسیلے ٹوٹ گئے اور ۱۹۵۸ء میں سیاست سے بیزار ہو کر میں چیف جسٹس ہوگیا۔ القصہ سوائے آخری گناہ کے باقی سارے سیاسی گناہ میرے بھائی کے تھے اور اِس پر طرہ یہ کہ میرا ایڈریس سپریم کورٹ آف پاکستان لکھا تھا جہاں میرے سائے کا بھی سانس پھولنے لگتا ہے۔

اِس لیئے میں نے کہا کہ اے وہ لوگو! جو اپنے اچھے بھلے نام کو چھوڑ کر قرآن مجید

کی طرح الف لام میم استعمال کرتے ہو عبرت حاصل کرو ورنہ کسی دن بغیر تنخواہ کے چیف جسٹس یا وزیر بن جاؤ گے۔

دوسرا قصہ زیادہ نازک ہے یعنی میرا نام رستم کیوں رکھا گیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے بھی ایک زنگی کا نام کافور رہ چکا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیوی نے ایک دفعہ اپنے مہمانوں سے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ میرے شوہر ان کا ہمیشہ ذکر کرتے تھے۔ مدت کے بعد جب میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تو اپنے شوہر سے پوچھا کیا یہی ہیں رستم؟ جس سے میں نے قیاس کر لیا کہ ان کے شوہر نے ضرور کوئی رستمی کی بات کی ہوگی۔ اس طرح میرے ایک اور بہت پیارے دوست جو اب خدا کو پیارے ہو گئے ہیں، میرے اردو لہجے کی نقل کر کے مجھے چھیڑتے تھے مگر میں اردو پڑھتا ہی رہا اور مایوس نہیں ہوا۔ اور جن محترمہ نے کہا تھا کیا یہی ہیں آپ کے رستم؟ ان کی بات میں کچھ شاعرانہ غلط بیانی پائی جاتی ہے کیونکہ کچھ سال پہلے جب انھوں نے اسی واقعہ کا ذکر کیا تو یہ کہا تھا کہ میرے شوہر کہا کرتے تھے کہ گیانی صاحب (رستم نہیں) بہت گورے چٹے آدمی ہیں لیکن جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا تو ان سے پوچھا کیا یہی آپ کے گورے چٹے گیانی ہیں؟ انھوں نے کہا اب بیماری کی وجہ سے کالے ہو گئے ہیں۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطلب سفید گو تھا۔ اور اس کے علاوہ ہم نشینوں کے جمال کا بھی تو مجھ پر اثر ہوا ہے ورنہ آپ کے سر کی قسم! میں ایسا نہیں تھا۔

بات یہ ہے کہ میرا اصلی نام جلندھر خاں تھا اور آپ کے فائدے کے لیے یہ بات کہتا ہوں کہ پشاور کے مشہور ڈاکو کا نام ملتان تھا۔ جب پانچ چھ سال کی عمر تھی تو عید کے موقع پر والد مرحوم نے ہم تینوں بھائیوں کے لیے بوٹ منگوائے لیکن ہمیں تسمے باندھنے نہیں آتے تھے۔ والدہ نے سفارش والد سے کہا کہ بچوں کو

تسمے باندھنے سکھا دیئے۔ اُنھوں نے مذاق کرتے ہوئے کہا "اگر میں تمھارے لیے دوسری ماں لاؤں تو تم اُس کو سلام کرو گے؟" بڑے بھائی نے کہا 'ہاں' اور والد مرحوم نے اُن کے تسمے باندھ دیئے۔ میری باری آئی تو میں چُپ ہو گیا۔ والد نے پھر سوال کیا۔ میرے بھائی نے کان میں کہا کہ کہہ دو نا اِس میں کیا ہے۔ تمھارے سلام سے سچ مچ سوتیلی ماں تو نہیں آجاتے گی۔ پر میں نے کہا کہ اگر آ گئی تو؟ تیسری بار جب والد نے سوال کیا تو میں نے کہا کہ سلام تو نہیں کروں گا .... میرے تسمے کھُلے ہی رہ گئے اور میں غصّے میں باہر نکل آیا اور رونے لگا۔ اِس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ والد مرحوم اُن دنوں شاہنامہ پڑھتے تھے اوزن و گرز و میدان و افراسیاب و لا مصرعہ اُن کو پسند تھا۔ میرے نکلنے کے بعد کھِلکھلا کر ہنسے اور کہنے لگے 'یہ بھی بڑا رُستم بنا پھرتا ہے۔ اپنے باپ کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دیتا۔'

اُس دن سے جلندھر خاں کی بجائے میں رستم خاں ہو گیا اور جب ذرا مُہذّب ہُوا تو نام کے ساتھ محمّدؐ لگا لیا اور خان کاٹ دیا۔ مگر میرے بوٹوں کے تسمے ابھی تک کھُلے ہیں۔

II- بے ادبی

آیا کُتا کھا گیا تُو بیٹھی ڈھول بجا

افکارِ پریشاں

(قسط اوّل)

آج دو سال بعد میں پھر آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہوں۔ سجّاد صاحب سے
میں نے عرض کیا تھا کہ اس ادبی محفل سے خائف ہوں اس لیے کہ پہلی پیشی میں اُمید ہے
کہ میرے پیشے کے پیشِ نظر آپ پیشی کے لفظ پر مُعترض نہ ہوں گے ، جب میں نے
تقریر کی تھی تو آپ سب ایسے خاموش بیٹھے تھے جیسے آپ کے سامنے کسی مقدمے
کا فیصلہ سُنایا جا رہا ہو ، خصوصاً خواتین کے چہروں سے تو یُوں معلوم ہوتا تھا کہ اگر میری
تقریر لکھی ہوئی نہ ہوتی تو وہ اُلٹے خیال واپس لَوٹ جاتیں۔ (یہ اُلٹے خیال نیا مُحاورہ
ہے اُلٹے پاؤں کا ذہنی ہم زُلف) اگر فنِ ادب کے یہی معنی ہیں کہ ادب سے بیٹھا جائے
تو میں بے ادب ہوں اور اس بے ادبی پر آداب عرض کرتا ہُوں مگر سجّاد صاحب نے یہ
کہہ کر مجھے تسلّی دی کہ ایک تو پچھلی پیشی کا مضمُون فلسفیانہ تھا دوسرے اِن دو سالوں میں
میری گستاخیاں کافی مشہور ہو چکی ہیں۔ اِس لیئے آپ مجھ پر ضرور ہنسیں گے۔ غرض آپ
کے سیکریٹری آتے اور پُوچھنے لگے "آپ کو کس مضمون پر ہنسی آتی ہے ؟" میں نے
کہا "پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی" اب اپنے ادبی ذوق کی تعریف پر آتی ہے۔ اُنھوں
نے دل جوئی کے طور پر کہا "یہ کوئی مایوسی کی بات نہیں ہے۔ آپ اکبرؔ الہ آبادی کی طرف
رجوع کیجئے ممکن ہے اُن کے اشعار آپ کے بوسیدہ ربط میں ترنم پیدا کر دیں"۔ میں

نے کہا آپ مجھے شاعروں کی رُوحوں سے کیوں لڑاتے ہیں۔ زندگی کا ایک حصہ اقبال کے تین شعر یاد کرنے پر صرف ہوّا، اتنی زندگی میرے پاس کہاں کہ اکبر الہ آبادی کے بھی تین شعر یاد کر لوں۔ اُنھوں نے فرمایا میں آپ کو چند کتابیں دے دوں گا۔ آپ پڑھیئے اور دو چار شعر یاد کر لیجئے۔ اِس پر مجھے گولڈ سمتھ کے ایک مشہور کردار کی بات یاد آ گئی کہ مَیں اپنی لڑکی کو فرنچ خود پڑھاؤں گا کیونکہ سکولوں میں اچھا نہیں پڑھاتے لیکن پہلے مَیں خود فرنچ سیکھوں گا۔ نہیں حضور آپ کوئی اور مضمون سوچیئے۔ یہ کہہ کر میں تو کوہاٹ چلا گیا اور اِس امید میں رہا کہ اکبر الہ آبادی کے بعد نہ اُنھیں کوئی اصغر ایبٹ آبادی ملے گا جس کی شاعری پر مجھے تنقید کرنی پڑے اور نہ مجھے ستائیں گے مگر واپس آ کر کیا دیکھتا ہُوں کہ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، صاحب صدر بھی ہائی کورٹ کو تالا لگا کر لاہور سے ایبٹ آباد آ پہنچے ہیں۔ نیز ایک عدد ٹوکرا آموں کا بھیجا ہے۔ اُنھوں نے شاید کہیں پڑھا ہو گا کہ آموں سے دماغ برجستہ ہو جاتا ہے۔ اِس بات کی تصدیق کا مجھے تو موقعہ نہیں ملا کیونکہ میرے پہنچنے تک آم بچّوں کے پیٹ میں پہنچ چکے تھے اور گُٹھلیاں میرے لیئے محفوظ کر دی گئی تھیں۔ لہٰذا محاورے کے مطابق ہمارے ہاں تقسیمِ کار اِس طرح ہوئی کہ آم کھانے سے بچّوں کو مطلب اور پیڑ گنانے سے مجھے۔ اِس طرح آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات بھی سچ ہو گئی۔ القصہ سجّاد صاحب اگلے دن آئے اور آتے ہی پُوچھا کہ کوئی مضمون سوچا ہے۔ مَیں نے کہا کہ مضمون کیا خاک سوچوں میری پسلیوں میں درد ہے اور پسلیاں آموں کی گٹھلیوں سے تو نہیں جُڑتیں۔ اُنھوں نے پسلیوں کے درد کے لیے کئی نسخے تجویز کیئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ اگر دماغ پر زور ڈالا جائے اور کوئی مضمون لکھنا شروع کر دیا جائے تو پسلیوں کے درد کا احساس مٹ جاتا ہے۔ مَیں نے کہا کہ درد کو تو مَیں اور بہت سی بے فائدہ باتوں کی فہرست میں ملا کر بھُول سکتا ہُوں مگر سول سرجن نے اُن کو ایسا مضبُوط باندھ رکھا

ہے، میری پسلیوں کو، میری بے وفائیوں کو نہیں کہ درد بھی پسلیوں کے ساتھ بندھ گیا ہے اور اسی لیئے میں غالبؔ کے شعر کو اس طرح پڑھنے پر مجبور ہو گیا ہوں سے

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا درد کا پسلی سے جُدا ہو جانا

خیر بظاہر سجّاد صاحب نے کچھ ہمدردی کی مگر باوجود میرے پژمُردہ چہرے کے سیکرٹری کو بُلا کر انھوں نے پانچ مضمون لکھوا دیئے اور مجھے اختیار دیا کہ میں اُن میں سے کسی ایک پر طبع آزمائی کروں۔ گویا طبع آزمائی سے مَفر کی کوئی صورت نہیں اور آپ کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے چاہے پسلیوں میں درد ہو، چاہے آم کی گٹھلیاں چُوسنے کو ملیں۔ وہ کیا کہا تھا کسی فارسی شاعر نے سے

ظالم بہت ہیں لوگ تیرے شہر کے جاناں

اب وہ پانچ مضامین سینئے :-

۱- افکارِ پریشاں۔
۲- عدل و انصاف کی راہیں۔
۳- میری زندگی کے چند نفسیاتی واقعات (نفسانی نہیں)
۴- نوادر واقعات ۔
۵- پاکستان کس طرف اور ساتھ انگریزی میں لکھا تھا
WHITHER PAKISTAN

. یہ پہلا مضمون تو میری پریشاں حالی کو دیکھ کر تجویز کیا گیا تھا۔ ایبٹ آباد پہنچ کر سجّاد صاحب نفس شناس کے علاوہ نبض شناس بھی ہو گئے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ابھی تک میں اپنے افکارِ پریشاں کو جمع کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں جو آموں کی گٹھلیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں اور انشاء اللہ اس مضمون کے آخر

تک آپ کو پریشانی میں مبتلا رکھوں گا۔ آپ نے کافی آرام کے دن کاٹے ہیں تقسیم ہند کے بعد آپ کو اس قصّے نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ گاؤ آمد و خر رفت"۔ یا یہ کہ سُست رَو گئی اور تیز گام آئی۔ گاڑی دراصل وُہی رہی، صرف انجن بدلا۔ ٹکٹ بیچنے والے بھی وُہی رہے اور ٹکٹ دیکھنے والے بھی۔ آپ ٹکٹ خرید کر سفر کرتے رہے۔ گاڑی آہستہ ہوگئی یا تیز، آپ کے افکار کبھی پریشان نہیں ہُوئے بلکہ آپ نے افکار کو اپنے نزدیک ہی نہیں آنے دیا۔ تاکہ بے وجہ پریشانی نہ اُٹھانی پڑے۔ آپ کے سَر کی قسم آپ میں بہت صبر ہے۔ اگر میں آج آپ سے بارہ سال کا بدلہ نہ لے سکوں تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ میرے افکار تو شروع ہی سے پریشان رہے۔

اتنا مضمون تو مَیں نے موٹر گاڑی میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ لاہور سے آرہا تھا اور یہ اچھا موقعہ تھا کیونکہ سوائے ڈرائیور کے اور کوئی پریشاں خاطری کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ڈرائیور نے بھی پریشان کیا۔ ایک گدھے سے جو اچھا بھلا سڑک کے درمیان جارہا تھا ٹکر لگادی جیسے پہلے اُس کے راستے میں گدھے نہیں آتے تھے۔ ہمارے تجربے میں تو بہت سے گدھے آئے ہیں۔ اور ہر گدھا سڑک کے درمیان چلتا ہے۔ یہ قومی سڑکیں تو آخر گدھوں ہی کے لیے بنی ہیں۔ ڈرائیور میں یہ نئی بات دیکھ کر کہ گدھوں کو برداشت نہیں کرسکتا میں نے خود موٹر ہاتھ میں لے لی تھوڑی دُور گئے تھے کہ ایک اور گدھا جس کی شکل و صورت ہماری ہی طرح کی تھی بالکل سامنے آگیا۔ اُس سے موٹر بچانے کی غرض سے میں نے پہیہ زور سے گھمایا تو موٹر شیطان کی طرح جیخی کیونکہ میری تخلیق آگ سے ہوتی ہے اور اس شخص کی مٹی سے اور ناراض ہو کر احتجاجاً سڑک سے باہر نکل گئی جہاں پی ڈبلیو ڈی کے کارکن مٹی نکال کر چھوٹے چھوٹے گڑھے بنا دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کی موٹر سڑک سے باہر نکلے تو اچھی طرح سے گرے۔ چنانچہ ہماری موٹر پھسل کر پہلے ایک گہرائی میں گری، پھر اُچھل کر دوسری میں اور پھر تیسری

میں۔ خدا جانے اس کوپی۔ ڈبلیو۔ ڈی سے کیا دشمنی تھی معلوم ہوتا ہے جیسے ان گڑھوں میں محکمے کی گہرائیاں تلاش کر رہی ہو۔ آخر جب کوئی بھی نہ ملا اور میرے بائیں پہلو کی پسلیاں بھی کڑکڑنے لگیں اور گہرائی بھی اور کوئی نہ رہی تو ایک جھاڑی میں ٹھہر گئی۔ لوگ جمع ہونے اور کسی نے کہا آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ بچ گئے۔ میں نے کہا خوش قسمت کیا ہوں یہیں تو آموں کی گٹھلیوں اور ایبٹ آباد کی بزم ادب کے خیال میں غرق تھا جنہوں نے میری گاڑی کو اس جھاڑی تک پہنچا دیا۔ اب کے میری گاڑی یہاں سے نکال دو پھر کبھی شعر نہیں کہوں گا۔ مگر جب ایبٹ آباد کی رومانی فضا میں پہنچا تو سفر کی پریشانی بھول گیا اور پنسل لے کر لکھنے بیٹھ گیا۔ ابھی تھوڑا سا لکھا تھا کہ جسم کے اوپر ایک لطیف حرکت محسوس ہونے لگی اور پھر کھجلی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ کپڑے اتارنے پڑے دیکھا تو ودو عدد کھٹمل اپنے حسن عقیدت کا اظہار بلکہ مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ کھٹمل کیا چیز ہے کم از کم میں نہیں جانتا۔ شاید پسّو ہوں۔ بہر حال مچھر نہیں تھے۔ مگر کبھی آپ نے سوچا ہے کہ صرف دو کھٹمل ہی ایک پورے ملک کو کیا، پوری دنیا کے سیاسی جسم کو کاٹ کاٹ کر چھوندر بنا دیتے ہیں۔ کبھی وہ پسّو بن کر بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن میں یہ امتیاز نہیں کر سکتا کہ وہ کھٹمل ہیں یا پسّو۔ میں تو صرف مچھر کی شناخت کر سکتا ہوں اور اس لحاظ سے میں محکمہ زراعت والوں سے کچھ کم نہیں ہوں جو ترناب فارم سے خاص طور پر درختوں کا معائنہ کرنے کے لیے ایبٹ آباد آتے ہیں تو سیب اور بادام کے متعلق تو کوئی رائے دے نہیں سکتے البتہ آڑو کو پہچان لیتے ہیں۔ بات یہ ہوتی کہ میں نے کوئی آٹھ برس ہوتے یہاں کچھ سیب خوبانی اور بگوگوشے کاشت کرائے تھے جن کے پھل دینے کا وقت آ چکا تھا مگر خوبانی کے سوا باقی درختوں کا رویہ تو ویسا ہی لاحاصل نظر آتا ہے جیسے محکمہ زراعت کا ہمیں نے یہاں کے مقامی افسروں سے امداد طلب کی۔ دو سال ہوتے میں نے ڈپٹی کمشنر

کی وساطت سے زراعت والوں کو اپنے درختوں کی بیماری کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ آپ پڑھتے رہے ہوں گے کہ سرکار لوگوں کو شوق دلاتی ہے کہ محکمۂ زراعت کے ماہرین کے مشورے سے فائدہ اٹھائیں۔ مجھے بھی شوق ہوا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے محکمۂ زراعت کو اطلاع دی۔ ایک آدمی جو اپنے کو مقامی فروٹ سپیشلسٹ کہتا تھا، آیا اور میرے ایجنٹ سے کہنے کہا کہ ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اُوپر سے دباؤ ڈالنے کا کیا فائدہ ہے۔ تم اور میں یہیں کے آدمی ہیں مجھ سے ہی کہہ دیتے۔ چنانچہ اس شکایت کو رفع کرنے کے لیے دوسری دفعہ میں نے خود موٹر سڑک کے کنارے کھڑی کی جہاں انسپکٹر زراعت کا دفتر ہے۔ تین دفعہ ایسا کیا۔ انسپکٹر صاحب تو تینوں دفعہ نہیں تھے، کہیں کام پر گئے ہوئے تھے۔ وہی سپیشلسٹ ملا۔ وہ ایک دفعہ آیا بھی اور اُس نے بڑا بے بہا مشورہ دیا۔ سیب کے درختوں کو دیکھ کر کہا کہ ان کو کھاد دو اور خوبانی کی ہم وقت پر کٹائی کر لیں گے۔ میرے ایجنٹ نے کہا مگر سیب تو شاید جنگلی ہو چکے ہیں یعنی پیوند کے نیچے سے اُگے ہیں۔ سپیشلسٹ نے کہا جنگلی تو ضرور ہیں۔ میں نے کہا تو پھر جنگلی درخت سے کیا فائدہ؟ اس نے کہا یہ بات تو ہے۔

اس کے بعد میں نے چیری کے درخت دکھاتے جن کے پتے کسی کیڑے نے کھا لیے تھے مگر کیڑا غائب تھا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک کیڑا ہے جو پتے بھی کھاتا ہے اور بھاگ بھی جاتا ہے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ کبک دری ایک پرندہ ہے جو پہاڑوں میں رہتا ہے اور سنگ ریزے کھاتا ہے۔ اس سے بہتر راستے تو سپیشلسٹ کے لیے یہ ہوتی   کہ وہ پتے کھانے والی چیز ایک پرندہ ہے جو عمر تریبے کھاتا ہے۔ میں نے پوچھا آخر اس کا علاج کیا ہے؟ کہا علاج ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جو درختوں پر چھڑکا جاتا ہے اور جسے کھا کر کیڑے مر جاتے ہیں مگر اب تو یہ بھی ضروری نہیں ہے اس لیے کہ عنقریب کیڑوں کا موسم گزر جائے گا اور اسی لیے شاعر نے اس

عیار کیڑے کی طرف سے کہا ہے

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اور اے اہلِ بصیرت دیکھو کہ موسم کے ردّ و بدل میں تمہارے لیئے نشانیاں ہیں۔ آئندہ سال پھر پتّے نکلیں گے اور پھر کیڑے پتّوں کو کھالیں گے اور درختوں پہ زہر چھڑکنے سے پہلے پھر کیڑوں کا موسم گزر جائے گا لیکن زراعت کا محکمہ اسی طرح برقرار رہے گا۔

جب میں نے ایڈیشنل ڈائرکٹر زراعت کو اپنے درختوں کا حالِ زار سنایا تو انھوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، میں ترناب فارم سے کچھ سمجھ دار لوگ بھیج دوں گا۔ یہ لوگ وعدے کے مطابق ۲۴ اگست کو آئے۔ نہیں سمجھ دار تھا ہر۔ انھوں نے سارے حالات سُن کر رائے دی کہ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کون سے درخت جنگلی ہیں شاید نوے فیصد جنگلی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنے فارم کے متعلق زیادہ جانتے ہیں۔ سیب، بادام اور کھٹمل، وہاں نہیں ہوتے۔ باقی رہا بگوگوشہ تو وہ زراعت والوں نے اب چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر درخت پھل نہیں دیتے، تو جنگلی ہوں یا صحرائی، اُن سے کیا فائدہ؟ کاٹ کر پھینک دیں۔ میں نے کہا کہ اسی لیئے تو آپ کو تکلیف دی ہے کہ آپ وجہ دریافت کریں کہ درختوں میں پھل کیوں نہیں آتا۔ تاکہ آٹھ سال کی محنت برباد نہ ہو۔ پھل نہ آنے کی وجہ تو نہ بتا سکے، ایک صاحب نے گہرا سانس لیتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ یہ سب بھی عجیب مخلوق ہیں۔ آٹھ سال میں تو کروٹ نہیں لیتے ہو سکتا ہے کچھ عرصہ بعد پھل دینا شروع کر دیں۔ میں نے پھر چیری کے کِرم زدہ پتّوں کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے کہا یہ ایک بھونرا ہے جو رات کو آتا ہے اور سویرے چلا جاتا ہے۔ علاج؟ علاج یہ ہے کہ کوئی زہر چھڑکا جائے جو پیٹ میں درد پیدا کرے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ایبٹ آباد کی کمیٹی کا پانی ان پہ چھڑکوں۔

جس سے ضرور پیٹ میں درد ہوگا

باور آیا ہمیں پانی کا دوا ہو جانا

جو لوگ پشاور سے ایبٹ آباد آتے ہیں اُن میں سے بعض کے پیٹ میں تو جولیاں پہنچتے ہی گڑگڑاہٹ شروع ہو جاتی ہے۔

میں نے ان ماہروں کو رُخصت کرتے وقت کہا کہ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ آپ تو جانتے تھے کہ آپ نہیں جانتے۔ آپ نے یوں ہی زحمت اُٹھائی۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ اہلِ زراعت کے افکار ایبٹ آباد میں ہی پریشان ہو گئے تھے۔ یہ کوہاٹ میں بھی پریشان رہتے ہیں۔ ایک ایگریکلچرل اسسٹنٹ سے میں نے پوچھا کہ فلاں گاؤں میں ہیں نے ایک نیا کنُواں کھدوایا ہے وہاں کپاس کیسی رہے گی؟ اُس نے کہا کہ کوہاٹ کے ضلع میں کپاس نہیں ہوتی۔ میں نے کہا مگر ہماری پُرانی زمینوں میں تو ہوتی ہے۔ اُس نے کہا تو پھر کاشت کر دیں۔ ایک اور شخص کو جو پھلوں کا ماہر تھا میں نے کہا کہ ایک مالٹے کو بیماری لگ گئی ہے پتے سکڑ جاتے ہیں اور پھل چھوٹا آتا ہے۔ اُس نے کہا میں جا کر ٹھیک کر دُوں گا مگر وہ نہیں آیا میرے ایک بھتیجے سے اُس نے بہت رازدارانہ انداز میں کہا کہ میں اپنے محکمہ کے خلاف رِٹ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مطلب سمجھے؟ میں نے بھتیجے سے کہا:

حجامت بنانے کو آیا تھا نائی

حجامت بنانے ہی مانگی رضائی

مگر اُس نے تو حجامت سے پہلے ہی مانگی رضائی۔ بہرحال صرف ایک مالٹے کے درخت کے بدلے تو کوئی رِٹ نہیں جیت سکتا۔ اور یہ ہیں عدل وانصاف کی راہیں جن کے متعلق آپ کے سیکرٹری نے مجھے تقریر کرنے کا اختیار دیا ہے حضور! جب یہی ان لوگوں کے انصاف کا تقاضا ہے تو ہم سے کیا عدل وانصاف

کی راہوں پہ جا سُٹے نہیں ہوں گے ؟ بعد میں وہ بھیلوں کا ماہر حوادث مارشل لا کا شکار ہو گیا یعنی سکرین ہو کر برطرف ہوا اور میرا مالٹا سوکھ گیا۔ اب ہمارے دلوں میں کوئی کدورت نہیں رہی۔ ہم دونوں کے دل صاف ہو چکے ہیں۔

تو پُٹے دل پکارائیں چلاؤں ہائے بھیل

اور وہ انسپکٹر زراعت، جو تینوں دفعہ دفتر میں نہیں تھے اور کام پہ گئے ہوئے تھے انھیں بھی اتمام حجت کے لیے میں نے خط لکھا مگر خط بھی شاید اُن کے پیچھے پھرتا رہا کیونکہ وہ نہ آئے۔ اِس پر مجھے ایک عزیز یاد آئے (مجھے اِس قسم کی باتیں اکثر ستاتی ہیں) وہ عزیز محکمۂ انہار میں ہیں اور مہینے میں پچیس دن گھر پر رہتے ہیں باقی وقت دوروں پر۔ اپنے ماتحتوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی بڑا افسر میری غیر موجودگی میں شمال کی طرف سے آئے تو کہنا جنوب کی طرف گیا ہُوں اور اگر جنوب کی طرف سے آئے تو کہنا شمال کی طرف گیا ہُوں۔ مغرب کو وہاں بھی قبلہ تھا اور مشرق سے سُورج نکلتا تھا۔ اِس لیے یہ رُخ بتانے سے گریز کرتے تھے۔ ایک دفعہ دو افسر آئے، ایک شمال کی طرف سے ایک جنوب کی طرف سے، ماتحت سوچ میں پڑ گیا، کر اب کیا کہوں۔ فوراً عزیز کو تار دیا:

NORTH SOUTH DARK CLOUDS WHICH SIDE NOW

یعنی شمال اور جنوب کالی گھٹائیں ہیں اب کس طرف کا نام لوں ؟

لطیفہ یہاں ختم ہوتا ہے لطیفے کو کثیف بنانا ہو تو انسپکٹر صاحب سے پوچھیے لیکن اگر آپ نے 'انوارِ سہیلی' پڑھی ہو تو آپ کی مشکل حل ہو جائے گی کیونکہ اُس میں لکھا ہے کہ جب راجہ نے وزیر سے پوچھا کہ اگر انجان ایک اہلِ زراعت پر سوال کرے اور اہلِ زراعت کو خود بھی جواب کا پتہ نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اُس نے کہا "گم گشتہ شنیدہ حکایت گاما" کیا تم نے گاما کا قصہ نہیں سُنا ؟ گاما ایک دُور اُفتادہ

گاؤں کے جاہل لوگوں میں ایک ہی سیانا تھا۔ جب کبھی اُن کو کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو کہتے چلو گاما سے پوچھ آئیں۔ گاما نے سفر بھی کیے تھے بہت کچھ دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کے نام بھی اپنی لال کتاب میں لکھ رکھے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں میں ایک مینڈک آیا پہلے کسی نے مینڈک نہیں دیکھا تھا۔ اُن دنوں مینڈک شہر میں رہا کرتے تھے۔ کبھی کوئی جری مینڈک داسکوڈے گاما کا ہمسفر بن کر کسی نئی دنیا کو معلوم کرنے کے لیئے گاؤں کا رُخ بھی کر لیا کرتا تھا۔ ہاں آپ کو مغالطہ نہ ہو جس گاما کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ داسکوڈے گاما کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لوگ گاما کے پاس گئے اور مینڈک کے بارے میں سوال کیا۔ اُس نے اپنی کتاب نکالی اور لوگوں سے کہا کہ میری کتاب کے مُطابق یہ چیز یا ہاتھی ہے یا امرود۔

ممکن ہے آپ نے گاما کا قصہ اور طرح سے سنا ہو مگر "انوارِ سہیلی" میں ایسا ہی لکھا ہے۔ مَیں نے خود تو نہیں پڑھا، مجھے بھی گاما نے بتایا ہے۔ بہر حال دنیا میں گاما کئی قسم کے ہوتے ہیں اِس لیئے اگر آپ والا گاما کوئی ڈنڈ پیلنے والا پہلوان ہو تو میرا ایک تعلیم یافتہ اہلِ زراعت ہے۔ کبھی کبھی وہ ڈاکٹر یا انجینئر بھی ہوتا ہے، مگر اِس دفعہ اُن گاموں کی باری نہیں ہے۔ اس لیے اس جانب مَیں آپ کے افکار کو پریشان نہیں کروں گا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں خود بھی گاما تھا یعنی حکومت کا قانونی مشیر تھا۔ جب بھی حکومت کسی مشکل میں ہوتی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ وقتاً فوقتاً کانفرنسیں ہُوا کرتی تھیں۔ "وقتاً فوقتاً" کیا ہر دوسرے تیسرے روز۔ اب بھی ہُوا کرتی ہیں۔ سیکرٹری، وزیر، گورنر اپنی قیمتی رائے دیتے ہیں۔ تصویریں لی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تصویر لینے والے کو ہم علیحدہ چائے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ تاکہ عین اُس وقت تصویر لے جب ہم گول میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہیں۔ اور لوگ اخبار

میں دیکھیں کہ کتنے زور کی رائے دے رہے ہیں۔ مجھے چونکہ قانونی طور پر رائے دینی ہوتی تھی اس لیے اکثر خاموش رہتا۔ ایک تو اس لیے کہ مجھے خود کم علم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب پریس ایکٹ کے بارے میں مجھ سے سوال کیے جاتے۔ "اچھا صاحب کیانی صاحب۔ یہ فلاں اخبار بہت تنگ کر رہا ہے۔ اس کا کیا تدارک کریں؟" میں کہتا "ضمانت ضبط کر لیجیے۔" وہ پوچھتے کہ اگر اس نے ہائیکورٹ میں درخواست دے دی تو پھر؟ میں کہتا درخواست تو ضرور منظور ہو گی۔ وہ پوچھتے پھر کیا کریں؟ میں کہتا کہ پھر ضمانت ضبط نہ کیجیے۔ دیکھا کیسی اچھی رائے دی۔ سانپ بھی نہ لوٹے اور لاٹھی بھی نہ مرے۔ بات جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں پہنچ گئی جیسے گھوڑا دوڑ بھاگ کے تھان پر واپس آ جاتا ہے۔ اور یہاں یہ تھان پر واپس آنے کی بات پر مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ آپ حیران ہوں گے کہ لوگ ہم سے کیسے کیسے قانونی مشورے مانگتے ہیں۔ میرے ایک عزیز کی بیوی نے پوچھا، اور پوچھا بھی خط لکھ کر کہ آپ مقدموں کے فیصلے تو کرتے ہیں ذرا مجھے بھی ایک قانونی مشورہ دیجیے۔ میری ایک سہیلی کو اپنے خاوند کے چال چلن پر عرصے سے شک تھا۔ ایک دن اُس نے دیکھا کہ وُہ ایک آٹھ برس کی لڑکی سے جو گھر میں نوکرانی تھی، چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ آپ سے قانون میں مردوں کو تو اجازت ہے کہ اگر بیوی کو کسی غیر مرد سے اختلاط کرتے دیکھیں، تو اُسے جان سے مار دیں۔ میری سہیلی پوچھتی ہے کہ اگر مجھے موقع ملے تو کیا میں بھی اپنے خاوند کو جان سے مار سکتی ہُوں۔ بہت جلد جواب دیں۔ میں نے پڑھا تو پسینے آنے لگے۔ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی قریب تو نہیں ہے۔ کہیں کسی اور نے خط پڑھ لیا تو مشہور کر دے گا کہ میں لوگوں کو قتل کے مشورے دیتا ہُوں اور قتل بھی اپنے ایک عزیز کا۔ وُہ زبانی پوچھتیں تو شاید صلاح بھی دے دیتا۔ جیسے سیشن جج کے زمانے میں ایک دفعہ کسی کو صلاح دی تھی۔ وُہ قصہ پھر کبھی سُناؤں گا۔ مگر سیشن جج کے زمانے میں

قتل کی صلاح دینا اور بات ہے۔ کسی مرحلے پر پہنچ کر تو انسان کی طبیعت میں اصلاح آنی چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ بذریعہ ڈاک قتل کا مشورہ دینا کونسی مردانگی ہے یا اِس قسم کا مشورہ لینا کہاں کی نسوانیت ہے؟ اِس طرح کی راز کی باتیں تو صرف کسی مجلسِ ادب میں ہی کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ میں نے نہایت احتیاط اور دانش مندی سے جواب دیا۔ آپ سُن کر حیران رہ جائیں گے کہ دنیا میں اِس قدر دانش مندی ابھی تک موجود ہے میں نے کہا کہ آپ کے وفورِ غم سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصّہ آپ کی سہیلی کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ اگر آپ جیسی لالہ رُخ کا خاوند ہشت سالہ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو وہ بہت نالائق ہے۔ اُس کو ذرا ٹھہر جانا چاہیئے تھا مگر یہ آپ غلط سمجھی ہیں کہ مرد اِن حالات میں عورت کو قتل کر سکتا ہے۔ البتہ مرد کے لیے کچھ غیرت کا معاملہ ہے جو عورت کے لیے نہیں۔ بلکہ اُس کو تو فخر کرنا چاہیئے کہ آٹھ برس سے زیادہ عمر کی لڑکیوں کی طرف اُس کا خاوند دیکھتا بھی نہیں جب تک وُہ خود اُس کی طرف نہ دیکھیں۔ اس کے علاوہ قتل کرنا انتقام کا، ایک فرسودہ طریقہ ہے اور فرسودہ چیزیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں۔ طرزِ جدید یہ ہے کہ عورت اگر خاوند کو کسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھے تو مُنہ پر تھپڑ رسید کر دیتی ہے۔ میرے ایک دوست کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے مگر یہ نہ سمجھیئے کہ میں بھی دوست کے پردے میں آپ بیتی بیان کرتا ہوں۔ یہ جدید طریقہ ہے اور روایتی طریقہ وُہ ہے جو مسز پیپس MRS PEPYS نے اختیار کیا تھا۔ اس نے اوپر کی منزل سے دیکھا کہ اس کا خاوند نیچے نوکرانی سے پیار کر رہا ہے۔ اوپر سے چلّائی "کیا کر رہے ہو؟" پرانے لوگوں میں کتنی وضعداری تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ کیا کر رہا ہے مگر پھر بھی خاوند کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیا۔ خاوند بھی حوصلے والے ہوتے تھے۔ آجکل کے دوسُوتی ڈارلنگ نہیں جو گھبراہٹ میں سب کچھ مان لیتے ہیں اور پھر ڈر کے مارے مکان بیوی کے نام ہبہ

کر دیتے ہیں۔ ہاں انکم ٹیکس بچانے کی غرض سے ایسا کرتے تو ایک بات ہوتی، اور میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ مکان کرائے پر بھی نہ دیا ہو تو فرضی کرائے پر ٹیکس دو۔ وُہ چیز جو آپ کے پاس آئی نہیں وہ اِنکم کیسے ہوتی ہے؟ ہمارے تمدّن میں فرضی باتیں اِس قدر آ گئی ہیں کہ ہم محض تصنّع کے ڈھانچے بن کر رہ گئے ہیں اور اِس لیئے اپنی حکومت سے بھی فرضی باتیں کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خیر مسٹر پیپس باحوصلہ انسان تھے۔ اُنھوں نے بیوی کی آواز سُنی تو اُوپر کی طرف دیکھا ہی نہیں جس لڑکی کو پیار کر رہے تھے اس سے فوراً کہا مُنہ کھولو۔ مُنہ کھولو۔ لڑکی نے حیرت سے منہ کھولا۔ کہا اور منہ کھولو اور منہ کھولو۔ تو پیپس صاحب نے کہا اوہو تمھارا گلا تو بہت خراب ہے۔ میں یہی سمجھتا تھا۔ تمھاری آواز سے پتہ چل رہا تھا۔ پھر مسکراتے ہُوئے بیوی کی طرف اوپر کو دیکھا اور کہا "ڈارلنگ اس لڑکی کے گلے تو بہت خراب ہیں اس کا علاج کراؤ۔" بیوی نے جھنجھلا کر کہا مگر تم تو اُس کے ہونٹوں کو پیار کر رہے تھے۔" پیپس صاحب نے بڑی سادگی سے کہا "ڈارلنگ میں تو اُس کا گلا دیکھ رہا تھا اُس کے ہونٹ بھی میرے ہونٹوں سے لگ گئے ہوں گے۔" اس کے بعد اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ تُو تُو، مَیں مَیں، اُوہ اُوہ، بالآخر دونوں راضی ہو گئے اور پردہ اس طرح گرا جس طرح گرا کرتا ہے (مگر میں نے اس خاتون کو لکھا) محترمہ ابھی تک نہ قدیم طرز کی بیویوں نے اور نہ جدید طرز کی بیویوں نے خاوند کی لب نوازی پر پستول یا خنجر اُٹھایا ہے اور آپ یہ کہتی ہیں کہ جب موقعہ ملے تو خاوند کو مار دیا جائے۔ آپ کو مارنا ہی ہے تو غصے کی حالت میں ماریئے کیونکہ وُہ قانونی حیثیت سے فوری جذبہ کے تحت آجاتا ہے۔ مگر یہ آخری بات مَیں نے خط میں نہیں لکھی۔ یہ تو آپ کو بصیغۂ راز بتا رہا ہُوں۔ ہاں یہ لکھا کہ اگر آپ نے خاوند کو مار ہی دیا تو مرد تو مرد عورتیں بھی آپ کو چڑیل کہیں گی کیونکہ عورت کی لطافت کے ساتھ خون کا تصوّر نہیں سجتا۔

آنسوؤں کا تصور زیادہ زیب دیتا ہے، وُہ آنسو جو خوب صورت آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں اور جنھیں خاوند کسی طرح زمین پر نہ گرنے دے۔

می زیبدت بہ نرگس شہلا گریستن

میں نے بات گھوڑے کے تھان پر واپس آنے سے شروع کی تھی۔ خاوند بھی ایک قسم کا گھوڑا ہے کہ تھان پر آئے بغیر نہیں رہتا۔ تو اے نیک بیویو! جب تمھارے گھوڑے تھان پر واپس آئیں تو اُن پر زیادہ سوال نہ کیا کرو۔ مرد فطرتاً چوپائے ہوتے ہیں یعنی چار شادیاں کرنے والے۔ شادی کبھی اُن کی جائز ہوتی ہے اور کبھی ناجائز۔ اِن ناپاکوں کی یہی سزا کافی ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اور جب نادم ہو کر گھر واپس آئیں تو اُن پر بے جا سوال نہ کرو۔ یہ ہے طریقِ عدل و انصاف کی راہ ڈھونڈنے کا۔ جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے میرا خیال ہے میں نے اچھی راہ نکالی ہے کیونکہ وہ خاوند ہشت سالہ نوکرانی کے جوان ہو جانے کے بعد بھی زندہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس کون سی عدل و انصاف کی راہیں ہیں؟ کچھ تو قانونی رکاوٹیں ہیں کچھ رکاوٹیں ہم خود پیدا کر لیتے ہیں۔ جیسے کسی وکیل کو خوش کرنے کے لیے ہم حکمِ امتناعی جاری کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں سیشن جج تھا۔ ایک شخص کا مقدمہ زائد المیعاد ہونے کی وجہ سے خارج ہوا۔ اُس نے کہا یہ عدالت تو نہ ہوئی۔ میں نے تلخی سے جواب دیا۔ تلخی میرے دل میں تھی، زبان پر نہ تھی اور تلخی کا سبب یہ تھا کہ میں بے اختیار تھا۔ میں نے کہا کون کہتا ہے کہ یہ عدل و انصاف کی جگہ ہے یہ تو کچہری ہے۔ اور آپ یقین جانیئے کہ میری عدالتی زندگی اسی عدالت اور کچہری میں توازن قائم کرنے پر صرف ہوئی ہے۔ ہائی کورٹ میں جس کو لوگ عدالتِ عالیہ کہتے ہیں اگر کبھی ایسی کوشش میں نے کی ...... مگر خیر اُن کوششوں

کا ذکر چھوڑ یئے۔ ہم تو ابھی تک عدل وانصاف کی پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں شاہراہیں تو ملی ہی نہیں۔ شاہراہوں تک پہنچنے کے لیئے ضروری ہے کہ آپ اور ہم مل کر کوشش کریں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں دیانت داری سے کام لیں۔ دفتروں میں باتوں سے زیادہ کام کریں۔ ہل چلانا ہو تو زمین کو زیادہ کھودیں۔ لڑکوں کو پڑھانا ہو تو اس طرح پڑھائیں کہ چھٹی کے دن بھی وہ مدرسے کے خواب دیکھا کریں۔

جمعہ بہ مکتب آورد طفیل گریز پائے را

یا پھر ایک دیوانی عدالت کو لیجیئے جس نے محرّر کو جمعبندی کے ساتھ طلب کیا ہو۔ محرّر پٹواری پہلے تو آتا نہیں۔ جب آتا ہے تو بغیر جمعبندی کے۔ اِس موقعہ پر عدالت تین چار ماہ کی تاریخ دے دے کیونکہ جمعبندی سامنے ریکارڈ روم میں پڑی ہے اور محرّر پٹواری آدھ گھنٹے میں جا کر لاسکتا ہے اور کیا کیا کہوں۔ جس انگریز ڈپٹی کمشنر نے مجھے سروس کے ابتدائی مراحل سے نکالا وہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستانیوں میں (اُس وقت ہندوستان واحد تھا) یہ بڑا نقص ہے کہ کوئی کام انہماک سے نہیں کرتے۔ ان کی توجہ سطحی اور سرسری ہوتی ہے۔ اور میں اپنے محدُود حلقے میں یہی تلقین کرتا رہا ہوں کہ یا تو کام کرو ہی نہیں اور اگر کرنا ہے تو اچھی طرح سے کرو۔ جن سعادت مندوں نے میری نصیحت سنی ہے انھوں نے میری ہدایت کے پہلے حصّے پر عمل کرتے ہوئے سرے سے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

مگر میں واعظانہ رنگ اختیار کرتا جا رہا ہوں۔ آپ مجھے اور جو کچھ چاہیں سمجھیں لیکن یہ یقین رکھیئے کہ میری نفسیاتی زندگی پند و نصیحت سے دُور ہے۔ میری زندگی کے نفسیاتی واقعات جن کے متعلق آپ کے سیکرٹری صاحب نے پوچھا ہے وہی ہیں جو آپ کو سنا چکا ہوں اور جو اِس قسم کے افکارِ پریشان میں اُلجھے ہوئے ہیں اور ابھی تک ایسا کوئی بڑا معرکہ سَر نہیں کیا جسے نوادرِ واقعات میں سے تصوّر کر کے

آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اِنہی چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں کو لے کر تاریخ بنائی جا سکتی ہے۔ میرے لیے تو حجامت کا سامان خریدنا بھی ایک نفسیاتی واقعہ بلکہ ایک اچھا خاصا حادثہ بن جاتا ہے۔ پچھلے مہینے مَیں انارکلی میں شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز کی دُکان پر گیا کہ حجامت کے پانی کے لیئے ایک پیالی خریدوں۔ اِس کی ضرورت اِس طرح محسوس ہُوئی کہ میری پُرانی پیالی بہت پُرانی ہو چکی تھی جو ۱۹۳۴ء میں خریدی تھی۔ پچھلے سال مئی کے مہینے میں رحمٰن صاحب اور مَیں کراچی میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ہُوئے تھے۔ رحمٰن صاحب چونکہ میرے دل میں رہتے ہیں اس لیئے اُن کا ذکر زبان پر آہی جاتا ہے۔ آپ کو کہیں غلط فہمی نہ ہو اِس لیئے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تین مشہور رحمانوں میں سے یہ کون سے رحمٰن ہیں۔ ایک رحمٰن جو بہت مشہور ہے اچار مُربے کا کام کرتا ہے اور اس کی فیکٹری امرتسر کی سڑک پر واقع ہے۔ دوسرا رحمٰن جو اُس سے زیادہ مشہور ہے حجام ہے۔ گورنمنٹ کالج کے زمانے سے ہم اُسے جانتے ہیں۔ لڑکے ابھی بستروں میں سوئے ہوتے تھے کہ وُہ حجامت کر کے چلا جاتا تھا اب پنشن پر ہے اور وہ مجھے کبھی کبھی دمے کے نسخے بتاتا رہتا ہے کیونکہ خود اُس کا دمہ کسی طرح ٹھیک نہیں ہوتا۔ تیسرے رحمٰن وُہ ہیں جو اتنے مشہور نہ ہو سکے اور جنہوں نے اپنا عہدہ میرے سپرد کرنے کے باوجُود اپنی رومانی شاعری میں سے ایک شعر بھی میرے لیئے ترکے میں نہیں چھوڑا۔ حالانکہ لوگ اس غلط فہمی میں مجھے ادبی جلسوں کی صدارت کے لیے بُلاتے ہیں کہ میں نے ان کا عہدہ سنبھالا ہے تو اُن کے اثاثے پر بھی قبضہ کر لیا ہو گا۔

القصہ مَیں اور رحمٰن صاحب ایک مکان میں ٹھہرے ہُوئے تھے۔ ایک روز اُن کا ایک دوست آیا اور منہ دھونے کے لیے غسل خانے گیا وہاں اُس نے میری حجامت والی پُرانی پیالی دیکھی۔ باہر آ کر رحمٰن صاحب سے پوچھا کہ یہ نائی کی کٹوری آپ

نے کس لیئے رکھی ہے ؟ رحمٰن صاحب نے فوراً کہا یہ میری نہیں گیانی صاحب کی ہے۔ منجملہ اور شکایتوں کے رحمٰن صاحب سے مجھے یہ بھی شکایت رہی ہے کہ وہ میری پردہ دری کرتے ہیں۔ اب وہ اپنے دوست سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ کٹوری تو میری ہے مگر گیانی صاحب نے تحفۃً دی ہے اس لیئے دل نہیں چاہتا کہ پھینک دوں یا گیانی صاحب ہی کی سہی مگر ان کی شادی میں بیوی نے تحفۃً دی تھی اس لیئے بیوی کے خیال سے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ میں جب اُن سے اس قسم کی شکایت کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ میں تمھاری شہرت کے لیئے یہ باتیں پھیلا تا ہوں اور میں ٹھہرا سیدھا سادا بچھان۔ ان کی باتوں میں آجاتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ اگر اُور کوئی چیز نہ رکھ سکا تو نانی کی کٹوری ہی سہی۔ غرض اس کٹوری کا قصہ ختم کرنے کے لیئے میں شیخ عنایت اللہ کی دکان پر گیا۔ کٹوری تو ان کے پاس نہیں ملی مگر جیسے ان کو معلوم ہو کہ میرا شیونگ برش بھی پڑا ہے اور آئینہ بھی ٹوٹا ہوا ہے یہ چیزیں میرے سپرد کر دیں۔ ان صاحبان کو یہ سب باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔ پھر کہا یہ ایک خاص چیز لیجئے پھٹکری کی پنسل۔ اِس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر حجامت کرتے وقت چہرہ کٹ جاتے تو پنسل اُوپر لگانے سے زخم بند ہو جاتا ہے اور خون رک جاتا ہے۔ میں نے کہا اب خون کی کمی کی وجہ سے چہرے نے کٹنا چھوڑ دیا ہے اور چہرہ نہ کٹنے کی وجہ سے خون کا نکلنا بند ہو گیا ہے۔ اب مجھے پھٹکری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا یا سیفٹی ریزر کا کرنا سمجھئے کہ اگلی صبح شیو کرتے ہوئے میرا چہرہ کٹ گیا میں نے سوچا میری زندگی بھی کیسے نفسیاتی واقعات میں اُلجھی ہوئی ہے۔ وہاں شیخ عنایت اللہ نے چہرہ کٹنے کا ذکر کیا یہاں میرا چہرہ کٹ گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میری ناک کا ذکر نہیں کیا۔

اس تقریر کے لکھنے کے بعد کل مجھے معلوم ہوا کہ چودھری نذیر احمد خاں بھی ایبٹ آباد آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ایک ایسا واقعہ یاد آیا جس سے کبھی کبھی میرے دل میں ایک

کھڑکی سی کھل جاتی ہے اور پھر میں اسے زور سے بند کر دیتا ہوں۔ ۱۹۴۶ء کی گرمیوں میں میں شملہ گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان بننے سے پہلے کا وہ زمانہ کس طرح ہنگاموں سے پُر تھا۔ قائداعظم بھی کسی کانفرنس کے سلسلے میں وہیں تھے۔ مدّت سے میری آرزو تھی کہ قائداعظم سے ملوں۔ چنانچہ میں رکشا میں بیٹھ کر ان کے مکان پر گیا۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ جب میں اُن سے ملا تو میں نے انکو ایک مفید مشورہ دیا جس پر انھوں نے فرمایا کہ آپ مجھے دو سال پہلے ملے ہوتے تو پاکستان پہلے بن گیا ہوتا تو آپ مان لیں گے اور کئی لوگوں نے آپ سے ایسی باتیں منوائی ہوں گی کیونکہ قائداعظم تو اب اُن کی تردید نہیں کر سکتے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں اُن سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے نہ ملے اور میرے دل میں اُن سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔ میں نے اُن کے سیکرٹری کو بتایا کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس نے پوچھا کوئی کام ہے۔ میں نے کہا کام تو کچھ نہیں صرف تمنّائے زیارت کھینچ کر لائی ہے اس نے کہا پھر وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ میں نے کہا آپ میرا کارڈ تو لے جائیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی سی ایس دیکھ کر وہ یہ تو سمجھ جائیں گے کہ محض شاعر نہیں ہوں جو وادیوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ (یَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں) مگر کیا پتہ کہ سیکرٹری نے کارڈ دکھایا یا نہیں، اگر نہیں دکھایا تو خدا اُسے نہ بخشے، واپس آکر اس نے میرے کارڈ کے ساتھ مجھے بھی واپس کر دیا۔ میں باہر نکل کر ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کسی سے کہا جائے کہ تم نوکری سے ڈسمس کر دیے گئے ہو۔ کچھ دیر کھڑا رہا کہ سر میں جو چکر کی کیفیت تھی اُس پر قابو پالوں پھر رکشا کی طرف چلا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ رکشا میں سوار کوئی اُن کے گھر سے نکلا۔ اخباروں میں جو تصویریں نکلا کرتی تھیں اُن سے میں نے پہچان لیا کہ یہی قائداعظم ہیں میرا پژمردہ چہرہ ایک دم تازہ ہو گیا اور میں نے وفورِ شادمانی میں بڑے اشتیاق سے

سلام کیا۔ اُنھوں نے ایک کشادہ تبسم سے میرے سلام کا جواب دیا۔ بس میں سمجھا کہ میری زیارت ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو ملاقات کی حسرت مٹانے کا پھر ایک موقعہ آیا۔ گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں وہ بطور گورنر جنرل قیام پذیر تھے۔ ہم سب کو دعوت نامے آئے اور ساتھ ایک ایک کارڈ بھی جس پر اپنا نام لکھنا تھا۔ تاکہ اُس کارڈ کو دیکھ کر گورنر کو تعارف کرانے میں سہولت ہو۔ میں بڑے شوق سے چلا۔ عبدالعزیز خاں، جو اب ہمارے ایک جج ہیں، میرے ساتھ تھے۔ راستے میں ایک مقام پر سڑک کی مرمت ہو رہی تھی۔ موٹر کار کا ایک پہیہ وہاں گر گیا۔ میری موٹر کا پہیہ سال میں ایک دو بار ضرور کسی ایسی ہی جگہ گر جاتا ہے۔ اس چھوٹے سے حادثے کی وجہ سے ہم قریباً آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچے۔ تعارف کی تقریب ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ گویا میں وہاں بھی قائداعظم سے ہاتھ ملانے سے محروم رہا۔ دُور ہی سے دیکھتا رہا۔ گو بہت عقیدت اور فخر سے دیکھتا رہا۔ اِس آرزو کی راکھ میں ایک دفعہ پھر گرمی پیدا ہوئی جب کئی سال بعد میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے ہاتھ ملایا۔ یہ واقعہ چودھری نذیر احمد خاں مرحوم کے مکان پر ہوا۔ آدھا ثواب اُن کی رُوح کو ملا۔ مرحوم سے کہیں یہ نہ سمجھیئے گا کہ وُہ خدا نخواستہ سُرگباش ہو گئے ہیں وہ بالکل زندہ ہیں بلکہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ مرحوم کا مفہوم جو کچھ ہو میرا مطلب یہ ہے کہ اللہ اُن پر رحم کرے کیونکہ وہ اب اٹارنی جنرل ہو گئے ہیں۔ اللہ بخشے اُنھیں، یعنی جب بخشنے کا وقت آئے۔ بیچارے اچھے آدمی تھے۔ ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی سُنا دیتے تھے۔ مگر میری نظر اُن کے کسی اور پہلو پر رہتی تھی۔ وہ کبھی کبھی کوئی خُطبہ پڑھتے تھے تو اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتے تھے۔ اور اُس کی نقل میرے پاس بھی بھیج دیتے تھے۔ میں پڑھ کر خوش ہوتا تھا۔ مگر خدا اُن کی رُوح کو نہ شرمائے اب وُہ اٹارنی جنرل ہو گئے ہیں۔

اب میں آپ کی انجمن سے پُوچھتا ہوں کہ آپ کے پہلے چار مضمونوں میں سے کس کس پر بحث ہوئی۔ اگر آپ کو اِس میں معنی نظر نہیں آئے تو میں یہ پوچھوں گا کہ کیا اُستادوں کے کلام میں آپ معنی ڈھونڈتے ہیں۔ یہ چہارہ آتشہ مرکّب جو میں نے پیش کیا ہے "آبِ حیات" کے ایک قصّے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ ایک دفعہ امیر خسرو کا گزر ایک کنوئیں کے پاس سے ہوا جہاں چار عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اُنھوں نے اُن سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اُن عورتوں کو معلوم تھا خسرو شاعر ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ پانی اُس وقت دیں گے جب کوئی شعر سناؤ۔ انھوں نے پُوچھا کیسا شعر سُناؤں۔ ایک نے کہا ایسا شعر سناؤ جس میں کھیر کا ذکر آئے۔ دوسری نے کہا نہیں چرخے کا ذکر آئے۔ تیسری نے کہا کتّے کا ذکر آئے۔ چوتھی نے کہا ڈھول کا ذکر آئے۔ خسرو نے برجستہ کہا: ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
. . . . لا پانی لا

میری یہ انمل بے جوڑ کہانی سُن کر جب تک آپ ڈھول بجانے پر تیار ہوں میں پانچویں مضمون کا بھی ذکر کر دُوں۔ یعنی پاکستان کس طرف

WHITHER PAKISTAN اردو ترجمہ کدھر پاکستان زیادہ برجستہ ہے۔ اِس کا آسان جواب یہ ہے کہ جدھر پاکستان اُدھر ہم۔ "مگر پاکستان کس طرف" کی بات ہو تو میرا خیال ہے کہ پاکستان اب پنچایتوں کی طرف جا رہا ہے اِس لیئے آپ بھی جائیں اور میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں ۔

پنبہ کُجا کُجا نہم

افکارِ پریشاں

(قسطِ دوم)

یہ ریڈیو پاکستان کا ہِل اسٹیشن ایبٹ آباد ہے۔ اس سے افکارِ پریشاں کا نغمہ سنیئے جس کے خاص سُر یہ ہیں:

۱۔ افکارِ پریشاں (قسطِ ثانی)

۲۔ میں نے کیا دیکھا۔

۳۔ نیرنگیٔ زمانہ (اِک تماشا ہُوا گِلہ نہ ہُوا)

۴۔ چند معاصر

۵۔ تجرباتِ زندگی، کچھ اپنے کچھ پرائے (بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں)

۶۔ ہمارا سماجی ماحول (پنبہ کجا کجا نہم)

صاحبان! میرا اس بزمِ ادب میں آنا اب ایک سالانہ فیچر بنتا جا رہا ہے جو چیز آپ کے لیئے ضیافتِ طبع ہے میرے لیئے ایک سالانہ امتحان کی صُورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ میں سے بعض حضرات دُعا کرتے ہوں کہ الٰہی یہ اگلے سال تک زندہ رہے مگر آپ کی دُعا سے میرا فشارِ خون جس کو آپ سلیس زبان میں بلڈ پریشر کہتے ہیں اور بھی گر گیا ہے اور میرے اُستاد کہا کرتے ہیں کہ جس کا بلڈ پریشر زیادہ نہ ہو وہ دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اِس لیئے آپ کم از کم اگلے

سال کی جیٹیوں تک مجھ سے بلند خیالی کی توقع رکھیں۔ اور اگر اس پست ہمتی کے عالم میں کوئی اونچا خیال دور سے باول کی طرح نظر آتے تو اسے باول نخواستہ نظر کی غلطی سمجھیں۔ اور اگر کسی بات پر ہنسی آتے تو اتنے زور سے نہ ہنسیں جیسے پچھلے سال ہنسے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو نظر لگ جائے۔ مجھے تو نظر لگ گئی کچھ اپنی کچھ پرائی۔ اس کا نتیجہ میرے بلڈ پریشر کا گرنا ہے۔ دوسرا نتیجہ ارباب علم وادب کا یہ اصرار ہے کہ میں بھی اُن میں سے ہوں۔ مجھے اس طرح کے جھوٹ بولنے کی تو عادت نہیں ہے کہ میں انکسار میں یہ کہوں کہ میں اُن کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہوں مگر اتنا بھی سچائی کا شہید نہیں کہ صرف اپنی نااہلیت کے باعث ادب کی کرسی پر بیٹھنے کے اعزاز سے دستبردار ہو جاؤں۔ ویسے کسی اور طرح سے شہید ہونا، بشرطیکہ شہادت پر کچھ خرچ نہ آئے، برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے اس شخص کا قصہ یاد آیا جس کو اُسے دوستوں نے کسی خاص مطلب سے مشورہ دیا تھا کہ تم نواب صاحب بن جاؤ۔ اُس نے کہا کہ مجھے تو نوابی کے ڈھنگ نہیں آتے ہیں کیسے نواب بنوں۔ یار دوستوں نے کہا اس میں کیا مشکل ہے۔ تم سُرخ تنزیب کا اچکن اور طلائی جوتا پہنو، ایک گاؤ تکیہ پیچھے رکھو اور ایک پیچوان آگے اور ہم جو کچھ تم سے پوچھیں اس کا صرف ایک ہی جواب دو "کیا مضائقہ ہے۔" مگر یہ خیال رہے کہ قاف کی آواز گلے کے اندرونی اندرون سے نکلے پس نواب صاحب مذکورہ بالا آداب میں سے کچھ پہن کر اور کچھ پاس رکھ کر بیٹھ گئے۔ یار دوست ارد گرد بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا "نواب صاحب پان پیش کیا جائے؟" جواب دیا "کیا مضائقہ ہے۔" پان پیش کیا گیا۔ دوسرے نے کہا، "نواب صاحب رقص ہو؟" فرمایا "کیا مضائقہ ہے۔" رقاصہ آئی اور اُس نے اپنے رقص سے نواب صاحب کو محظوظ کیا۔ القصہ جب کئی مراحل بلا مضائقہ طے ہوئے تو ایک ظریف نے پوچھا "نواب صاحب آپ کی پاپوش سے خاطر کی جائے؟"

جواب ملا "کیا مضائقہ ہے۔" نواب صاحب یہ سمجھے کہ پاپوش کوئی راگنی ہوگی۔ کیونکہ
فارسی میں مذکر و مؤنث کا فرق نہیں ہوتا۔ یہ واحد مذکر، جمع مذکر کی گردان اُردو بولنے
والے ہی کرتے ہیں اور جمع کا صیغہ اکثر مؤنث ہوتا ہے بلکہ مؤنث ہوتی ہے۔ اور
اُس کا نام اپوار رکھتے ہیں جو آپا سے اسم تصغیر ہے۔ اچھا تو بات ہو رہی تھی مصنوعی
نواب صاحب کے پاپوش نگار چہرے کی اور وہ بھی مثال کے طور پر۔ میرا کچھ مطلب
یہی تھا۔ "گر خدا یاری کند امسال سید می شوم۔" خدا کی یاری ہو یا نہ ہو، آپ کی ہمت
سے اگلے سال میں ادیب فاضل ہونے کا اعلان کر دُوں گا۔ اور اُس کے لیئے چند
اردو فارسی کے شعر اور چند ادبی محفلوں کی صدارت کو کافی
سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔ مگر صدارت کے لیے تو جسٹس سجاد احمد جان ہی سجتے ہیں یا
صدارت اُن کو سجتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ آپ کو بتائیں گے "میں سمجھتا ہوں
کہ کیانی صاحب نے ایک نئے طرز بیان کی داغ بیل ڈالی ہے۔" داغ بیل کیا مارکول
کے مٹکے ڈالے ہیں۔ آپ چلتے ہُوئے ہوشیار رہیں کہیں پھسل نہ جائیں۔ سوچ سمجھ کر
چلیں مگر بدگمانی نہ کریں "ہر کہ شک آرد کافر گردد"۔ اگر جسٹس سجاد یہ باتیں کہنے کا
ارادہ نہ رکھتے ہوں تو میری صلاح ہے کہ ضرور کہہ دیں۔ میرے ایک دوست، جو
مذکورہ بالا سرمائے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ادبی مال و متاع رکھتے ہیں۔ مجھے
ہمیشہ پریشان کیا کرتے تھے۔ ان کی پڑھی ہُوئی کتابوں سے میں ناواقف ہوتا تھا
مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری پڑھی ہوئی ہر کتاب کا وہ مطالعہ کر چکے ہیں۔ جب میں کسی نئی کتاب
کا نام لیتا تو وہ کہتے "ہاں اس میں فلاں کردار کو بغیر کفن کے دفن کر دیا گیا تھا تاکہ کفن دُزدی
کا اندیشہ نہ رہے یا یہ کہ فلاں کردار نے اپنی بیوی کو اس غلط فہمی میں عاشقانہ خط لکھا
تھا کہ وہ کوئی دوسری عورت ہے۔" میں حیران و پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کہاں سے
اتنی کتابیں پڑھ لیتا ہے۔ اگرچہ بُرا گمان کرنا جائز نہیں ہے۔ میں کبھی کبھی ایسے

گمان کر کے صریحاً غیر متشرع ہو جاتا ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ "کبھی کبھی" کی قید میں نے اپنے اُوپر غلط لگائی ہے۔ بہر حال مجھے شک ہُوا اور اُن سے پوچھا کہ جب بیوی کو اپنے خاوند کا عاشقانہ خط ملا تو اُس نے کیا کیا۔ اُنھوں نے گول مول جواب دیا "ایسی صورت میں ایک عورت کیا کرتی۔ بس وہی کیا جو عورتیں کیا کرتی ہیں" میں نے کہا "یہی تو تمھاری غلطی ہے۔ وہ محض عورت نہ تھی ہیروئن تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ کم از کم دُور سے میرا خاوند مجھے حسین سمجھتا ہے اور اس خوشی میں اُس کو اجازت دے دی کہ دوسری عورت سے بھی شادی کر لے یا کم از کم محبّت کا اظہار کرتا رہے"

اپنے دوست سے میں نے کہا کہ مجھے اب پتہ چلا کہ تم جھوٹ بھی بولتے ہو اور بہ تحقیق جان لو کہ یہ جو تم کسی اخبار یا رسالے کی تنقید پڑھ کر رائے دیتے ہو ہر ایک قسم کا ادبی سرقہ ہے جو دوسری قسم کے سرقوں سے زیادہ ترش ہوتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اے نیم پُختہ خربوزے میں نے کب جھوٹ بولا تھا۔ تم نے یہ تو نہیں پوچھا تھا کہ میں نے کتاب پڑھی ہے یا نہیں۔ اور اتنی کتابیں پڑھنا . . . . کیا مجھے باولے کتے نے کاٹا ہے۔ اس دن سے میں بھی ایک آدھ شعر یاد کر لیتا ہوں۔ مگر جس آسانی سے شعر یاد کرتا ہوں اُس سے زیادہ آسانی سے بھول جاتا ہوں۔ مثلاً اس وقت مجھے یہ مصرعہ یاد ہے۔ ع

بھول جانا نہ ہمیں یاد ہماری رکھنا

مگر آئندہ سال تک میں اسے ضرور بھول جاؤں گا۔ جب کوئی مجھ سے کسی ایسے شعر یا مصرعے کا ذکر کرتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ اس شعر کے بعد میں نے اتنا کچھ پڑھا ہے کہ پچھلے سال کا سارا علم اس کے نیچے دب گیا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت پڑھنے والوں کا علم جسے عمل کی ہوا نہ لگے دب کر کھاد بن جاتا ہے۔

یٔں جب بھی اُردو فارسی کے چند اشعار کو ادبی مجالس کی صدارت کا تجارتی سرمایہ بناتا ہُوں تو مجھے "چند تصویرِ بُتاں"، چند حسینوں کے خطوط" یاد آتے ہیں جو مرنے کے بعد کسی شاعر کے گھر سے نکلے تھے۔ تصویرِ بُتاں کو تو میں نے اپنی زندگی ہی میں تلف کر دیا ہے اور اس دشوار کام میں میری وفادار بیوی ہمیشہ بغیر پوچھے مجھے مدد دیتی رہی ہے۔ آپ کا بھی یہی تجربہ ہو گا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ یٔں اپنے متعلق جھوٹی باتیں مشہور کر کے شہرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اِس پر مجھے اُس دوست کی بات پھر یاد آتی جو زندگی میں میرا دوست بھی ہے اور ہمسفر بھی۔ اُس نے فیروز پور سے خط لکھا کر لدھیانہ سے (جہاں ہم پہلے رہتے تھے) چند خواتین آئی تھیں۔ انھیں "بیگم کے (K)" سے ملنے کا اتفاق ہُوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کبھی کبھی سچ بھی بولا کرتے ہو۔ میں نے کہا یہ کبھی کبھی کی قید کیوں لگاتے ہو، میں تو حضرت عبدالقادر جیلانی کی طرح ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔ صرف اچھا خمیر حاصل کرنے کے لیے اس میں پانی کی طرح تھوڑی سی جھوٹ کی آمیزش کر دیتا ہوں جس سے ایک سُندر امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ سُندر کا لفظ میں نے کیوں استعمال کیا یہ ایک الگ داستان ہے جو پھر کبھی آپ کو سناؤں گا۔

پچھلے سال میں نے مسز پیپس کا قصہ سُنایا تھا جس نے اپنے خاوند کو گھر کی خادمہ سے پیار کرتے دیکھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کسی ایسے شخص نے جس کو میری سماجی پیغمبری پر شک رہتا ہے کسی دوسرے ایسے شخص سے پوچھا کہ یہ مسز پیپس کون ہے؟ اُس نے جواب دیا "کوئی مُوسی نا"۔ پہلے شخص نے بات کی گہرائی کو سمجھ کر بڑے رازدارانہ طریقے سے سر ہلاتے ہوئے کہا "ضرور کوئی ہوئی" اب اگر یہ صاحبان اُس مُوسی خانم کا سُراغ لگانے کا تہیہ کر بیٹھیں تو میں کہیں کا نہ رہا کیونکہ یہ اُن سچی باتوں میں سے نہیں جن کا ذکر میں حضرت عبدالقادر جیلانی کی سی

راست گوئی سے کرتا ہوں۔ اُن کا یہ قصّہ تیسری جماعت میں پڑھا تھا کہ ایک سفر میں جاتے وقت اُن کی ماں نے دینار اُن کے جُبّوں کے تلووں میں سی دیئے تھے راستے میں ڈاکوؤں نے آگھیرا۔ ظاہری مال و متاع چھین کر اُنھوں نے پوچھا اور بھی کچھ ہے؟ جواب دیا "ہاں جوتے میں اتنے دینار ہیں"۔ وُہ ہنسنے کو دیکھیں بنا رہا ہے۔ اُن دنوں بنانے کا لفظ عام فہم نہیں تھا اس لیے پیر بغداد نہیں سمجھے اور یہ نہیں کہا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ ڈاکو چلے گئے اور پُونجی جُوتے سمیت سلامت رہ گئی۔ اسی اصول پر میں بھی کم از کم اپنے گھر میں ضرور سچ بولا کرتا ہوں جس پر نیک بخت بیوی کو کبھی اعتبار نہیں آتا اور نہ مجھے اس کا رنج ہوتا ہے کہ میری بات کو مذاق پر محمول کیا جاتا ہے۔ دو تین سال بعد جب اُن کو کسی اور ذریعے سے کچھ معلوم ہو جاتا تو کہتیں "آپ تو چھپے رستم نکلے" میں کہتا "آپ سے کیا چھپا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں آپ کو ہمیشہ سچی بات بتاتا ہوں تاکہ مجھ سے پہلے کوئی عورت آپ کو نہ بتائے کیونکہ عورتیں چغل خور ہوتی ہیں اور میں خود ہی اپنی چغلی اُن سے بہتر کرسکتا ہوں"۔ وہ کہتیں "مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ سچ بھی بولتے ہیں میں سمجھی آپ مجھے بنا رہے ہیں"۔ میں کہتا "اب تو جانے دیجئے، بات دو تین سال پرانی ہونے کی وجہ سے زائد المیعاد ہو گئی ہے۔ مگر نہ پیر بغداد نے ڈاکوؤں کو بنانے کی کوشش کی تھی نہ میں نے آپ کو۔ یہ محض آپ کا حُسنِ ظن ہے کہ آپ مجھے راست گو نہیں سمجھتیں"۔

تو ہاں میں "چند تصویر بُتاں، چند حسینوں کے خطوط" کا ذکر کر رہا تھا تصویر بُتاں تو یُوں تلف ہوئیں باقی رہے حسینوں کے خطوط۔ وہ مجھ سے ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے لے لیے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اورینٹل کالج کے پرنسپل ہیں۔ اس دفعہ مجھے ایبٹ آباد میں اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ادب میں مُبتلا لوگوں کا

وصال ایبٹ آباد ہی میں ہوتا ہے۔ انھوں نے خط لکھا، میں نے بھی لکھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حسینوں کے خطوط وہ اِس طرح جمع کر رہے ہیں۔ اُن کی دُور بین نگاہ کو حسن بھی کہاں نظر آیا۔ پھر مجھ سے ملے تو میں نے دیکھا کہ ایک دُور بین کانوں میں بھی لگائی ہے ویسے اُس آلے کا نام دُور شنو ہونا چاہیئے۔ یعنی دُور سے سننے والا آلہ۔ اِس لیئے کہ وہ نزدیک سے نہیں سنتے اور اگر سنتے ہیں تو بُری بات ہی سنتے ہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں کہ دونوں میں سے پہلے کون اللہ کو پیارا ہوتا ہے تاکہ دوسرے کو موقعہ ملے کہ اس کے خط چھپوا دے اور ساتھ تمہیداً لکھ دے کہ جو نیک لوگ ہیں وہ ہمیشہ داغِ مفارقت دے جاتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے کون زیادہ نیک ثابت ہوتا ہے۔

میں نے تقریر کے شروع میں کہا تھا کہ یہ سالانہ جلسہ میرے لیے ایک امتحان بنتا جا رہا ہے۔ اِس دفعہ تو میرے ساتھ وہی ہُوا ہے جو ایک سُست طالب علم کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہُوا کرتا ہے۔ مجھے وقت پر بلکہ وقت سے پہلے ہی نوٹس ملا تھا کہ یہ جلسہ پچھلے سال کی طرح ہوگا۔ اگر کوئی تبدیلی اِس میں ہو سکتی ہے تو صرف اتنی کہ فرماں روایانِ انگلستان کے جنم دن کی طرح اِس کی تاریخ آگے پیچھے کر دی جاتی۔ میں نے سیکرٹری صاحب کو، جو بلا قیل و قال، بلا قیدِ ماہ و سال، بدستور افضل مرزا ہی چلے آتے ہیں لکھا کہ اول تو میں موڈ میں نہیں، دوسرے ابھی کیا جلدی ہے۔ طالب علم بھی یہی کہتا ہے کہ ایک مہینہ تو چھٹی منائیں پھر چھٹیوں کا کام شروع کریں گے۔ مہینہ گزرنے کے بعد بھی شیطان یہی کہتا ہے کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ پھر جب دس پندرہ دن رہ جاتے ہیں تو سانس پھولنے لگتا ہے اور شیطان تو کہیں نظر نہیں آتا کہ اُس کو فریبِ جُرم میں تازیانے لگائے جائیں مگر افضل مرزا نظر آنے لگتے ہیں، وارثِ جائز، بلا شرکتِ غیرے۔ اِس قسم کے

قانونی فقرے ہم اکثر بغیر سمجھے بُوجھے سُنا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اُن کو غلط یا صحیح
استعمال کرنے کو دل بھی چاہتا ہے۔ بہرحال جب موت کی طرح جلسے کا مُعیّن
وقت آن پہنچتا ہے تو رنجور مُوڈ کا بہانہ کارگر ہوتا ہے نہ فشارِ خُون کا۔ یہ مُوڈ کا لفظ
آپ کی طبعِ رسا نے محسوس کر لیا ہوگا کہ انگریزی ہے۔ بعض لوگ کتنی جلدی سمجھ
جاتے ہیں۔ ایک انگریز خاتون اپنے خاوند کے متعلق کہا کرتی تھیں کہ وہ اتنے دانشور
ہیں کہ کسی ہندوستانی کا نام سُن کر ہی بتا دیتے ہیں کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ مثلاً عبدل مرد
کو کہتے ہیں اور عبدی عورت کو۔ اگر انھوں نے وہ گانا سُنا ہوتا جو کبھی کبھی ریڈیو پر
سننے میں آتا ہے تو انھیں مرد اور عورت کی تمیز میں اور بھی آسانی ہو جاتی "عبدالرحمٰن
کی میں عبدالرحیمنا"۔ یہ مُوڈ کا لفظ گو انگریزی ہے مگر میں اُس وقت سے اسے استعمال
کرنے لگا ہوں جب سے بعض لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی ہے کہ مسٹر کی بجائے کون
سا لفظ استعمال کیا جائے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ سب کو خان کہو۔ میرے ایک
دوست جب مُوڈ میں ہوتے ہیں تو مجھے طغیانی صاحب کہتے ہیں اور جب مُوڈ
میں نہیں ہوتے تو خان کہتے ہیں۔ جب مُوڈ زیادہ خراب ہو تو دسترخوان بھی کہہ دیتے
ہیں۔ یوں بھی مُوڈ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت بااُس کے ہم معنی الفاظ
میں کہاں۔ ہاں اگر چڑت کا لفظ کبھی سُنا ہو تو مُوڈ سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں نے جب
پہلی دفعہ سُنا تھا تو کہنے والے نے کہا تھا "بر پدرشاں لعنت چڑت مرا خراب کردند"
کس موقعہ پر کہا گیا تھا اور صیغہ واحد مونث کا تھا یا جمع مونث کا، یہ رحمٰن صاحب
بتا سکیں گے۔ اُن کا حافظہ بھی غضب کا ہے۔ میرے دماغ میں تو فشارِ خون
کے گرنے سے صرف موٹی موٹی لکیریں رہ گئی ہیں۔ مگر یہ شیطان میرے کانوں میں
پھر کیوں گونجنے لگتے ہیں۔ شیطان کا نام لینے سے میں اب گھبراتا ہوں۔ کسی زمانے
میں شیطان سے اچھا میل ملاپ تھا۔ وہ اب رقیبوں سے ملتا ہے۔ گھبراتا اس

لیتے ہوں کہ ایک دفعہ میں نے شیطان کا ذکر حضرت آدم کے بہشت سے اغوا کرنے کے سلسلے میں کیا تھا تو کئی لوگ یہ سمجھے کہ شیطان کے پرنسے میں میں نے اُن کا ذکر کیا ہے حالانکہ اُن میں اغوا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ مگر اِنا کثیر من الرجال یہ اکثر ہوتا ہے کہ ہم دل کے آئینے میں جھانکتے ہیں اور ہمیں شیطان نظر آتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہم ہی ہیں بہ نفسِ نفیس۔ یا اپنی شکل نظر آتی ہے تو پہچان لیتے ہیں کہ یہ شیطان ہی ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے خواب میں شیطان کو دیکھا۔ آدم کے وقت سے اس پر غصّہ تو تھا ہی۔ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے شیطان کو ڈاڑھی سے پکڑ کر مُنہ پر زور سے تھپّڑ لگایا۔ تھپڑ جو مُنہ پر لگا تو جاگ اُٹھے دیکھا تو اپنی ڈاڑھی ہاتھ میں تھی۔ ے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھُلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

یہ شیطان کا ذکر غالباً میں اس غیر شعوری اثر کے تحت کر رہا ہوں جو جنٹس سجاد کی فہرست مضامین کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ امتحان میں زبان کے پرچے میں عموماً اس طرح کے سوال ہوتے ہیں: ذیل کے کوئی چھ الفاظ فقروں میں استعمال کرو یا مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک پر مضمون لکھو۔ ایک دفعہ ایک لڑکا انگریزی پرچہ کر کے نکلا اُس نے دوسرے لڑکے سے پُوچھا کہ تم نے کس چیز پر مضمون لکھا ہے۔ اُس نے کہا کہ 'دسہرے کے تہوار' پر لکھا ہے۔ پہلے لڑکے نے کہا کہ میں نے 'مہورام' پر لکھا ہے پُوچھا کیا لکھا ہے۔ جواب دیا کہ میں اُس کو جانتا تو نہیں تھا مگر سمجھا کوئی ہندو ہو گا۔ اور یہ تصور کر کے کہ متحنِ بھی ہندو ہو گا احتیاطاً میں نے لکھا کہ مہورام بہت سعادت مند لڑکا ہے۔ ہندو ہوتے ہُوئے بھی اشنان نہیں کرتا۔ البتہ سردی کے موسم میں انگلی

سے پانی اڑا اڑا کر پھینکتا ہے اور ساتھ کہتا جاتا ہے مہورام! مہورام! دوسرے لڑکے نے ہنس کر کہا "ارے مہورام۔ وُہ تو محرم پر مضمون لکھنا تھا۔ تم نے اُسے مہورام کیسے پڑھا۔" القصہ جسٹس سجاد نے بھی ایک فہرست دی ہے جس میں پانچویں نمبر پر یہ مضمون ہے۔ "تجربات زندگی، کچھ اپنے کچھ پرائے، اور قوسین یعنی بریکٹوں میں لکھا ہے کہ بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں۔" اس بیٹے میں نے زیادہ تر اپنے ہی تجربے بیان کیے ہیں اور جہاں کہیں شیطان کا ذکر ہے اُسے پرائی فہرست میں شامل سمجھیے۔ مگر جب میں کہتا ہوں کہ کسی زمانے میں شیطان سے اچھا میل ملاپ تھا تو پشیمانی کے جذبے سے نہیں کہتا۔ جسٹس سجاد صاحب سے میں نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کی پشیمانیاں مزے کی ہیں؟ انھوں نے گول مول جواب دیا۔ کہنے لگے ممکن ہے ہوں مگر آپ کی زیادہ مزے کی ہوں گی۔" میں نے کہا کہ ابھی تک تو میں پشیمان نہیں ہوا۔ یہ جواب میں نے اس لیے دیا کہ اس وقت مجھے تقسیم ہند سے پہلے کے ایک چیف منسٹر کا خیال آگیا تھا جس نے اپنی وزارت سے ہٹنے کے آٹھ دس سال بعد یہ کہا کہ میں نے اپنے وقت میں سیاست کے میدان میں بہت سے بڑے کام کیئے ہیں۔ مگر کسی ایک پر بھی کبھی پشیمان نہیں ہوا البتہ اب مجھے ایک بات کی پشیمانی ہے وہ یہ کہ میں نے دیوانی عدالتوں کے اختیارات چھیننے کی بھی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ احساس اگر اُس وقت ہوتا جب آپ برسر اقتدار تھے تو "تجھے ہم ولی سمجھتے........" اور مجھے تو یہ پشیمانی بھی نہیں۔

پکے راگوں کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں مگر سُنا ہے کہ آٹھ ہیں اور جسٹس کیکاؤس بتاتے ہیں کہ اُن میں سے ایک مالکونس بھی ہے۔ میری موسیقی کی کتاب میں نو پکے راگ ہیں اور مالکونس سے اگلے راگ کا نام صرف دیوانی نہیں بلکہ دیوانی عدالت ہے۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اس کو دیوانی عدالت کیوں کہتے

ہیں ؛ صرف اس لیے نہیں کہ مقدمے الوں کو دیوانہ کردیتی ہے بلکہ مقدمہ سننے والوں کو بھی دیوانہ بنا دیتی ہے ۔ میرے بھائی کیلاش (جو اب سپریم کورٹ کو پیارے ہو گئے ہیں) سنتے سنتے دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں ۔ خدا کرے کہ اب بھی منہ پھیرتے رہیں اور میں سنتے سنتے سو جاتا ہوں ۔ خدا کرے اب میں جاگ اٹھوں ، پیسے والے دیوانی میں دیوانہ کو کوئی نہیں پوچھتا ۔ اس کی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی بادشاہ نے اہلِ عدالت کو کام کرتے دیکھا تو کہا "اینہا دیوان اند" یعنی دیووں کی طرح کام کرتے ہیں اور آج کل تو خود دیو بننا پڑتا ہے ، آپ نے داستانِ امیر حمزہ میں دیو سیاہ کے سینگ دیکھے ہوں گے ۔ میں تو عینک کی بجائے وہی سینگ لگاتا ہوں ۔

اس پشیمانی کے عنوان کے علاوہ پانچ اور عنوان ہیں ۔ سب سے پہلے تو وہی پچھلے سال والا مضمون ہے "افکار پریشاں" ، مگر اس دفعہ بریکٹوں میں قسطِ ثانی لکھا ہے ۔ یہ ایک نئی قسم ہے افکار کی ۔ اس کے بعد ہے "میں نے کیا دیکھا؟" اور بریکٹوں میں لکھا ہے ع

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

یہ تو کچھ مہر رام جیسا مضمون ہے ۔ میں نے کیا دیکھا ؟ وہی جو آپ نے دیکھا زیادہ سے زیادہ مہر رام کو دیکھا ۔ بس فرق یہ ہے کہ کوئی رام کو دیکھتا ہے کوئی رب کو اور فرق محض زبان کا ہے ۔ جیسے ایک شخص یا کریم کی بجائے یا کر بیڑ کا وظیفہ کرتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سرزنش کی ، حضرت موسیٰ سرزنش کرنے والے پیغمبر تھے ۔ سرزنش ہی پر کیا موقوف ہے کبھی جدت کے خیال سے ہاتھ سے مکا بھی مار دیتے تھے ۔ ایک بچارے دہقان نے فرطِ محبت میں اپنے خدا کو مخاطب کر کے دودھ کی بالٹی پیش کی ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ تو کفر ہے ۔ اپنے منہ میں روئی ٹھونس و ، پنبہ را اندر دہانِ خود فشار ، ان دنوں خون کا فشار نہیں ہوتا تھا ،

پلیہ سے فشار کر لیتے تھے اور پلیہ چونکہ صرف منہ میں نہیں ٹھونسا جاتا بلکہ زخموں پر بھی
لگایا جاتا ہے اس لیے ہم اپنی فہرست کے اگلے مضمون پر پہنچ رہے ہیں جس کا عنوان
"ہمارا سماجی ماحول" اور بریکٹوں میں لکھا ہے "پلیہ کجا کجا نہم" یعنی کس کس زخم کا لہو ٹپکنے
سے روکوں۔ زخموں کا جائزہ تو پھر لوں گا پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سال جسٹس
سجاد کے پرچے میں بریکٹ بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایک سال ہائیکورٹ میں رہ کر
اُنھوں نے شاید محسوس کر لیا ہے کہ ساری جوڈیشری بریکٹوں میں ہے۔ ہم کہتے
ہیں کہ ہم اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ بریکٹوں کے باہر کی آلائشوں سے پاک رہیں۔
آپ کہتے ہیں (جب میں آپ سے کہوں تو آپ اپنے کو بریکٹوں میں ڈال دیا کریں۔)
جس کا مدعا یہ ہوگا کہ حاضرین کے سوا باقی سب یعنی بہ استثنائے حاضرین

PRESENT COMPANY EXCEPTED آپ کہتے ہیں کہ ہم

اس لیے بریکٹوں میں ہیں کہ ہم کو بریکٹوں میں کر دیا گیا ہے اور ان بریکٹوں سے ڈر کر
میں نے ایک جگہ قوسین کا لفظ استعمال کیا پھر خاب قوسین سے ڈرا۔ آپ میں سے
جن خواتین نے نہ عربی کا مطالعہ کیا ہے نہ قرآن شریف کا۔ اُن کے فائدے کیلئے
بتانا چاہتا ہوں کہ قوس کمان کو کہتے ہیں۔ آپ نے قوسِ قزح تو سُنا ہوگا یہ تو قوس سے
بھی آگے بڑھ گیا۔ کسی نے پوچھا قوس تو ہوئی کمان، یہ قزح کس بزرگ کا نام ہے۔
مجھے خود معلوم نہ تھا۔ فیروز اللغات میں دیکھا۔ بڑی اچھی کتاب ہے۔ اگر چھاپے میں ذرا
زیادہ سیاہی ڈالتے۔ تو پڑھنے میں اور بھی اچھی ہوتی۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آج کل
رُوسیاہی اعلیٰ درجے پر ہے۔ بہر حال فیروز اللغات میں لکھا ہے قزح (بریکٹ میں
ع یعنی عربی نسل کا ہے) یہاں بھی بریکٹ۔ آگے لکھا ہے "مؤنث"۔ آسمان پر بھی
مونث کی قید سے چھٹکارا نہیں۔ پہلے مؤنث کو ہم گھروں میں قید رکھتے تھے۔ اب
ہم اُن کی قید میں ہیں عملی طور پہ یہ قید اسیرِ زلف والی قید سے زیادہ شدید ہے۔ مگر

آگے چل کر سمجھ میں آیا کہ قزح کیوں مؤنث ہے۔ لکھا ہے "قزح ایک فرشتہ ہے جو ابر کا مؤکل ہے" یہ ابر اور مؤکل تو مذکر کے صیغے ہیں۔ فرشتہ مؤنث کیسے ہؤا۔ اگر ابر کے مؤکل کی بجائے بادل کی دیوی ہوتی تو بات سمجھ میں آتی اور پھر فرشتہ کہہ کر اُس کو مؤنث بنانا کُفر نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ کُفّار فرشتوں کو اللہ میاں کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور اللہ میاں نے کہا کہ اپنے لیئے تو لڑکے تجویز کرتے ہو اور میرے لیئے لڑکیاں۔ یہ کیا مذاق ہے؟ مگر آگے سُنیئے۔ قزح بقول صاحبِ بُرہان شیطان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے قوسِ قزح کو شیطان کی کمان کہتے ہیں۔ ایسی باتیں پڑھ کر مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ اگر شیطان سے میرا میل ملاپ رہا تو فرشتے سے بھی زیادہ دُور نہیں رہا ہُونگا۔ انسان اتنا خطا و نسیان کا مُرکّب نہیں جتنا فرشتے اور شیطان کا ہے۔ کسی کا فرشتہ غالب ہوتا ہے اور کسی کا شیطان۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ قوس کمان کو کہتے ہیں اور قوسین یعنی دو کمانیں۔ قابِ قوسین سے مراد بقدرِ دو کمان۔ اور یہ جُملہ چُونکہ خدا اور اُس کے رسول کے قُرب کا درجہ بیان کرنے کے لیئے استعمال ہؤا ہے۔ اس لیے ڈرتا ہوں کہ کوئی ناراض نہ ہو جائے کہ قرآن شریف کے لفظ کیوں استعمال کرتے ہو۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ اس سال میرے پاس میری تقریروں سے متعلق کیسے کیسے خط آتے ہیں۔ وہ تعریف والے خط تو ڈاکٹر سیّد عبداللہ چھپوائیں گے بشرطیکہ میں اُن سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اُن دوسرے خطوط کا ذکر میں کبھی کبھی خود کر لیتا ہُوں تاکہ سند رہے کہ ساری دنیا میں ایبٹ آباد کی طرح سبزہ نہیں اور ایبٹ آباد میں بھی برف باری ہؤا کرتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ضمناً کہا تھا کہ آپ کبھی اسلامی جمہوریت، کبھی اسلامی فلسفے، کبھی اسلامی روزوں کا ذکر کرتے ہیں کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ اپنے اندر وُہ استقلال پیدا کریں جو اُس وقت کے عرب میں تھا۔ مگر خدارا اُسے اسلامی استقلال نہ کہیں۔ اِس پر کسی نے ناراض ہو

کرکہا کہ اول تو ایک جج کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ دُوسرے یہ کہ اگر آپ میں اسلامی جوش نہ ہو (یہ ایک اور اسلامی محاورہ ہے) تو نہ سہی خدا کے فضل سے لاکھوں ایسے موجود ہیں جو اسلام کے نام پر خون بہانے کو تیار ہیں۔

اب ہم خطرناک زمین پر پہنچ رہے ہیں (ایں زمیں را نام باشد کربلا)۔ خوں بہا کی تو قرآن میں بھی تعریف ہے مگر خون بہانے کے اور بہانے کچھ کم ہیں۔ مجھے ایک اور چیف منسٹر کا قصہ یاد آرہا ہے جو اپنے دوستوں سے کہتا تھا کوئی کارخدمت بتاؤ۔ ایک نے کہا کہ مسٹر دستخط نے مجھے تنگ کر رکھا ہے۔ اُس کا اگر کچھ کرسکیں تو۔ چیف منسٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ مجھے اُس شخص کا قصہ یاد آرہا ہے، جس نے میری طرح کسی دوست سے کہا کوئی کارخدمت بتاؤ۔ دوست نے کہا فلاں قصائی کی مجھ سے دشمنی ہے چلو اُسے ماریں۔" اس شخص نے کہا "نہیں بھائی قصائیوں کے پاس چھرے ہوتے ہیں ان سے مجھے مت لڑاؤ نہیں میرے بھائی! (چیف منسٹر نے اپنے دوست سے کہا) مجھے انگریزوں سے نہ لڑاؤ۔ اُن کے پاس بھی چھرے ہیں اور میں چھری چاقو سے ڈرتا ہوں مگر ڈرتے ڈرتے ایک چھوٹی سی بات اپنے بڑے منہ سے کہا کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ جذبہ خوں ریزی تو بہت قابل قدر ہے۔ اِس کے اظہار کے مواقع آتے بھی ہیں اور خدا نے چاہا تو آئیں گے بھی۔ مگر اس سے پہلے اگر آپ اپنے دل میں استقلال کی گرمی پیدا کرلیں اور ہیرلیند اولی کی طرح ڈاکوؤں کے سامنے اور میری طرح گھر کے اندر بھی سچ بولنے میں تامّل نہ کریں اور خیانت کو کسی شکل میں دیکھ کر خون نہ سہی آنسو ہی بہائیں تو آپ قومی حیثیت سے وہ کچھ بن جائیں گے کہ خون بہانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

کل صبح میں ٹہلنے گیا۔ درختوں کے ایک جھنڈ سے جسے جھگی کہتے ہیں ایک نوجوان نکلا اور اس نے تپاک سے سلام کیا۔ رستی کو بل دے رہا تھا میں خوش ہوا

کہ یہاں بھی لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ مگر وہ مجھے کسی قسم کا انسپکٹر سمجھا تھا۔ میں اور بھی خوش ہؤا کہ کبھی کبھی کسی انسپکٹر سے مشابہت کا دھوکا ہو تو مفید ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت جھگی سے دو تین بہت وحشی کُتے بھی نکلے تھے۔ مجھے تعجب ہؤا کہ کس محکمے کا انسپکٹر اپنے جسم کی روایتی فربہی کو اس طرح پگھلا سکا ہے کہ میرے جسم کے مُشابہ ہو جائے مگر یہ تعجب کا وقت نہ تھا۔ کُتے بڑھتے آ رہے تھے۔ میرا دل گھٹتا جا رہا تھا۔ انسپکٹروں کی لاج رکھتے ہوئے میں نے دلیرانہ کہا "سُناؤ کیا حال ہے۔ بلکہ کتوں پر رعب ڈالنے کے لیئے میں نے ہاتھ بھی ملایا۔ اگرچہ سارے انسپکٹر ہاتھ نہیں ملایا کرتے، اب آپ یہ نہ پُوچھیں کہ یہ کُتے کس نسل کے تھے۔ "کوئی نسل ہوسی نا"! اچھا تو میں نے کُتوں کے خیال سے جوان کا حال پُوچھا۔ اُس نے کہا کیا بتائیں دس چھٹانک چینی ملتی تھی۔ وہ بھی ایک دن ڈپو والے نے بتایا کہ پانچ چھٹانک ہوگئی ہے۔ عبدالقدوس خاں کا آدمی چینی لینے آیا تو اُسے بھی یہی بتایا۔ اُس نے کہا کہ لکھ کر دے دو مگر ڈپو والے نے لکھ کر نہیں دیا اور آخر اُس کو دس چھٹانک دی۔ اب ہر آدمی تو عبدالقدوس خاں کا آدمی ہے نہیں کہ اُس کو ڈرا سکے اب وہ پانچ چھٹانک اپنے لیئے بچا لیتا ہے۔ میں نے کہا "پنبہ کجا کجا نہم"۔ اُس نے ذرا سوچ کر کہا کہ پنبہ تو یہاں نہیں ہوتا۔ یہ سامنے پہاڑ ہے اس پر تو گھاس بکی ہوتی ہے۔ میں نے کہا چیل کے درخت کیوں نہیں لگاتے۔ کہا وہ تو جی پھر سرکار قبضہ کر لے گی۔ میں نے کہا ارے بگو گوشتے! اگر تمہارا مطلب محکمۂ جنگلات سے ہے تو وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے نگہبانی کرتا ہے۔ اُس نے کہا مگر جہاں ہم درخت نہ لگائیں وہاں تو کوئی نگہبانی نہیں کرتا نہ ہی خُود درخت لگاتا ہے۔

آج میں جنگلات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ اس سال مجھے کافی چیل کے درخت اور بیج ملے ہیں اور مجھ سے خاص طور پر کہا گیا ہے کہ ہمارا ذکر خیر نہ

ہو تو اچھا ہے اِس لیئے مَیں ذکرِ خیر نہیں کروں گا۔ البتہ جنگلات کے ذکر سے مجھے یوم درختاں یاد آیا۔ ہم ہر سال سنتے ہیں کہ پاکستان کا صرف دو فیصد یا دو اعشاریہ ایک صفر صفر ایک (۲۶۱۰۰۱) فی صد رقبہ زیرِ جنگلات ہے جو کم از کم پندرہ فی صد تو ہونا چاہیئے۔ پھر سنتے ہیں کہ اس سال ۹ اگست کو دس لاکھ بہتر ہزار چار سو اُناسی درخت کاشت ہوئے اور پندرہ فروری کو چار سو اُناسی کی بجائے چار سو اسی کاشت ہُوئے وُہ ایک فالتو درخت مَیں نے کاشت کیا تھا اور جہاں تک مجھے اِس بال سے نظر آ رہا ہے صرف وُہی ایک درخت اِس وقت کھڑا ہے۔ اب مَیں پوچھتا ہُوں کہ باوجود اتنی کاشت کے جنگلات کا رقبہ ۱۹۵۰ء سے اب تک دو اعشاریہ ایک صفر صفر ایک ہی کیوں چلا آ رہا ہے ؟ مَیں نے لاہور کی اُس سرکاری جائداد کا جسے جی۔ او۔ آر کہتے ہیں ذرا غور سے مُطالعہ کیا ہے کیونکہ مَیں وہاں صبح کو ٹہلا کرتا ہُوں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر سڑک کے چوڑائی کے برابر گھاس کی پٹڑیاں ہیں۔ ہر ایک پٹڑی میں دو قطاریں درختوں کی ہیں۔ پہلے تو قطاریں مکمل تھیں۔ پھر بیچ میں کچھ درخت سُوکھ گئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں سوکھنے رہے بلکہ شاعرانہ زبان میں سُوکھا کیئے سرکاری لوگ سوچا کیئے۔ سرکار خود بھی سوچتی رہی۔ سرکار ایسی باتوں میں مؤنث بن جاتی ہے لیکن مؤنث کے آرائشی اوصاف سے بے بہرہ رہتی ہے۔

اُس جوان سے جس نے چینی کے راشن کی شکایت کی تھی مَیں نے کہا اِس جگہ میں تو بہت درخت ہیں۔ اُس نے کہا ہاں یہ تو بال بال بچ گئے ہیں۔ یہ رقبہ تو چاند ماری کے لیئے مخصوص ہو گیا تھا۔ مگر ایک انگریز افسر نے یہ درخت دیکھے تو کہا کہ میں اِن کو خراب نہیں ہونے دوں گا۔ چاند ماری کے لیئے کوئی اور جگہ ڈھونڈو" مَیں نے پُوچھا کہ کیا اب آفیسر درختوں کی قدر نہیں کرتے ؟ اُس نے رسی کو بل دیتے ہوئے کہا" اب تو بنگلوں میں پاکستانی افسروں کی بیویاں باڑ کاٹ کر اپنے صحن

کا کام لیتی ہیں" رسی کو اس نے ایسے زور سے بل دیا جیسے پاکستانی افسر اس کے بل نکال رہا ہو۔

لیکن یہ خون بہانے کا جذبہ اگر ہر اس بات پر پیدا ہوتا ہے جو خودی کی نشوونُما کے لیئے مُضر ہے تو اس جذبے کو میں نے بہت مشکل سے پیدا ہوتے اور بہت آسانی سے مفقود ہوتے دیکھا ہے۔ مجھے پھر ایک پٹھان کا قصہ یاد آ رہا ہے۔ کیا کروں اب سکھ چلے گئے ہیں تو پٹھان ہی رہ گئے ہیں مگر اس دفعہ ایک بمبئی کا سیٹھ بھی قصے میں شامل ہے۔ یہ سیٹھ دیہاتیوں کو قرضہ دیا کرتا تھا اور سال میں دو دفعہ اصل زر یا سود لینے کے لیئے نکلتا تھا۔ اس عمل کو اُگراہی کہتے ہیں یعنی روپے جمع کرنا۔ اُگراہی کے لیئے ضروری ہے کہ ایک باڈی گارڈ بھی ساتھ ہو۔ چنانچہ ایک پٹھان کو ساتھ لے کر سیٹھ اُگراہی کے لیئے نکلا۔ واپسی میں دھوپ کی شدت تھی دونوں ایک سایہ دار درخت کے نیچے دو گھڑی آرام کرنے کے لیئے بیٹھ گئے۔ پٹھان چادر اوڑھ کر ایک طرف سو گیا۔ اتنے میں ڈاکو آئے اور سیٹھ کو لوٹ لیا۔ سیٹھ نے بہتیرا شور مچایا مگر پٹھان نہ جاگا۔ جاگا بھی تو چادر سے سر نکال کر اور آنکھیں مل کر پھر سو جاتا۔ ڈاکو خود دار آدمی تھے۔ اُن سے یہ ہتک برداشت نہ ہو سکی کہ سیٹھ کا محافظ اس طرح سوتا رہے جیسے اُن کا عدم وجود برابر ہو۔ اس لیئے اُنھوں نے جا کر پٹھان کی چادر کھینچی۔ اس پر بھی وہ سوتا رہا۔ پھر اس کی ٹانگ کھینچی۔ اس پر بھی وہ سوتا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں زور سے کھولیں اس پر بھی وہ سوتا رہا۔ اب ڈاکوؤں کی خودداری کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پٹھان کی نسوار کا ڈبہ پاس پڑا تھا۔ پشاوری نسوار جسے صاد سے لکھتے ہیں "عجب نصوار خوش رنگ است داعلیٰ!" ڈاکوؤں نے پٹھان کے جسم کے دوسرے نصف حصے سے کپڑا اُتارا اور وہی نسوار چھڑک دی۔ تب پٹھان جاگا۔ تب پٹھان کو غصہ آیا۔ تب پٹھان نے اپنا ڈنڈا لیا اور دست ہاتھی کی

طرح گرج کر ایسا حملہ آور ہوا کہ ڈاکو لوٹ کے روپے چھوڑ کر بھاگ گئے اور پٹھان نے کہا چلو سیٹھ اُٹھاؤ اُگراہی۔ اور سیٹھ، پٹھان اور روپے تینوں خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ اگلے دن سیٹھ نے پٹھان کی تنخواہ کا حساب کر کے اُس کو فارغ کر دیا۔ پٹھان حیران ہوا اور کہا کہ کل ہی تو میں نے جان اور نسوار پر کھیل کر تمھارے مال کو بچایا ہے اور آج مجھے نوکری سے الگ کر رہے ہو۔ سیٹھ نے کہا۔ میں تمھارا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا تم نے بہت دلیرانہ حملہ کر کے میری اُگراہی بچائی۔ مگر ایسا کرنے کے بیٹے چاہیئے کہ پہلے تمھاری چادر اُتاری جائے، پھر تمھاری ٹانگ کھینچی جائے، پھر تمھاری آنکھوں کو کھڑکیوں کی طرح کھولا جائے۔ پھر تمھارے جسم کے نصف حصے کو بے لباس کیا جائے۔ پھر نسوار چھڑکی جائے تاکہ تمھاری قومی غیرت کو ٹھیس پہنچے، تب تمھیں غصہ آتا ہے، تب تم خون بہانے پر تیار ہوتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنی محنت کون کرے۔

میں لاہور کے جی۔ او۔ آر کا ذکر کر رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ۱۹۵۰ء سال عیسوی میں سرکار کا سو چنا ٹھکانے لگا اور فیصلہ ہوا کہ جہاں درخت سُوکھ گئے ہیں وہاں اور لگائے جائیں کسی نے مجھ سے ایک دن پوچھا کہ یہ سرکار کون ہے۔ میں اُس وقت دھرمسالہ میں سیشن جج تھا اور اُس کو بتا رہا تھا کہ جب سے یہ سیشن ہاؤس بنا ہے۔ یہ کرسیاں بنی ہیں۔ سیشن ججوں کے روغن آلود بالوں کی چکناہٹ نے اُن کی پُشت کو ایسا کر دیا ہے جیسے ہر وقت دیا جلنے سے مزاروں کے سرہانے ہو جاتے ہیں۔ اب میں نے ان کی پوشش بدلوائی ہے۔ اب سیشن جج تیل بھی کم لگاتے ہیں۔ میرے مخاطب نے کہا شاید اسی لیے بعض کے سروں میں خشکی پڑھ جاتی ہے۔ آپ ضرور ہی میں تیل ملا کریں اور مجسٹریٹوں کو بھی اس بارے میں ہدایت کریں۔ سرسوں کا تیل سر کو ٹھنڈا رکھتا ہے اور ہتھکڑی کے منظنے کی طرف مائل نہیں

کرتا۔ اور یہ کرسیوں کی پوشش کیا آپ نے اپنے خرچ سے بدلوائی ہے؟ میں نے جواب دیا "نہیں" "یہ تو سرکاری خرچ سے ہوتا ہے۔ اس پر وہ پریشان ہوا اور پوچھا کہ یہ سرکار کون ہے؟ میں نے پہلے اس کو سمجھایا کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ کیا ہوتا ہے اور بجٹ کیسے بنتا ہے۔ یعنی جس حد تک میں خود فنانس ڈیپارٹمنٹ اور بجٹ کو سمجھتا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایک فنانس منسٹر ہوتا ہے اور ایک فنانس سیکرٹری اور جب وہ دونوں کسی مالی مطالبے کے متعلق لکھتے ہیں کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ اتفاق (ایگری) AGRE نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو حضرات ایگری نہیں کرتے۔ مگر اب میری سمجھ بڑھ گئی ہے۔ فنانس ڈیپارٹمنٹ ایک بڑا محکمہ ہے جس میں مذکورہ بالا دو صاحبان کے علاوہ اسسٹنٹ بھی ہوتے ہیں۔ اب سیکشن افسر بھی آ گئے ہیں۔ اُن میں سے کوئی ایک لکھتا ہے، کہ اگر ہائیکورٹ کا ہر جج اُتنا کام کرے جتنا سب نے مل کر ۱۹۵۸ء میں کیا تھا۔ تو چار ایڈیشنل ججوں کی بجائے تین کافی ہوں گے اور اخیر میں یہ کہ ہمیں ایگری نہیں کرنا چاہیئے۔ اِس پر اطلاع آتی ہے کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ ایگری نہیں کرتا بلکہ اکثر تو صرف ایف ڈی لکھ دیتے ہیں۔ خیر میں نے اپنے مخاطب کو یہ سب باتیں سمجھا دیں کہ کس طرح ہر محکمہ اپنی ضروریات اُوپر لکھ بھیجتا ہے۔ سیشن جج ہائیکورٹ کو لکھتا ہے اور ہائیکورٹ گورنمنٹ کو۔ اور جب وہ خرچ منظور ہو کر آتا ہے تو اِس مطلب کے لیئے سرکار سیشن جج ہوتا ہے اور اُن درختوں کی سرکار جو جی اوآر میں سُوکھ گئے تھے ایک اور محکمہ ہے مگر اُن کی اصل سرکار ایک بیلدار ہے جس کو ہم چودھری کہتے ہیں۔ اور جس دن پانی کی زیادہ ضرورت ہو تو چودھری جی کہتے ہیں۔ اُس چودھری جی نے سرکار کے حکم سے ۱۹۵۷ء کی منظوری کے بعد ۱۹۵۸ء کی بہار میں درخت لگانے کا اہتمام شروع کیا۔ اس سلسلے میں کئی

اقدام کرنا تھے۔ پہلا گڑھے کھودنا تھا، دوسرا گڑھوں میں مٹی ڈالنا، تیسرا اُس مٹی کو گڑھوں میں بھرنا، چوتھا اُن پر پانی چھوڑنا، پانچواں ذخیرہ میں سے درخت نکالنا چھٹا اور یہ سب سے ضروری قدم تھا اُن درختوں کو زمین سے نکال کر اتنے دن باہر رکھنا تھا کہ اُن کی جڑیں سُوکھ جائیں۔ پھر ساتواں قدم اُن سُوکھے ہوئے درختوں کو گڑھوں میں لگانا۔ یہ سب کچھ، سوائے جڑوں کو سُکھانے کے، ۱۴، ۱۵ فروری تک ختم ہو جانا چاہیئے۔ میں خود کبھی مارچ میں بھی درخت لگا دیتا ہوں مگر شام کو ذخیرہ سے نکال کر پندرہ منٹ کے اندر اندر نصب کر دیتا ہوں اور پھر پانی سے خوب بھر دیتا ہوں تاکہ درخت صبح کو آنکھ کھولے تو اُس کو یہ پتہ ہی نہ چلے کہ میں کہاں سے کہاں آ گیا ہوں۔

اب چودھری جی سرکار کی نگرانی میں فروری کے شروع میں گڑھے کھُدوانا شروع کرتے ہیں اور جب تک سارے گڑھے مکمل نہ ہو جائیں اگلا قدم نہیں اُٹھاتے۔ فروری کے آخر تک گڑھے مکمل ہو جاتے ہیں۔ پھر نہر کی مٹی آنے لگتی ہے۔ یہ نہیں کرتے کہ مٹی ساتھ ساتھ ڈلواتے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ قبل از وقت کام ختم ہو جائے اِس لیئے یہ کام فروری کے اخیر میں شروع کرتے ہیں تاکہ مارچ کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں ختم ہو۔ پھر تیسرے ہفتے میں گڑھے بھرنے شروع کرتے ہیں مارچ کے آخر میں پانی چھوڑ دیتے ہیں۔ اتنے میں ذخیرہ میں سے درخت نکلوانا شروع کرتے ہیں اور وہیں جمع کرتے جاتے ہیں۔ سرکار کر بتاتے ہیں کہ جڑوں کو مٹی یا ریت میں چھُپا کر رکھا جاتا ہے۔ یہ عمل کوہاٹ میں محکمہ جنگلات اور زنزناب میں محکمہ زراعت اور دیگر مقامات پر دیگر لوگ کیا کرتے ہیں۔ مگر جس سال میں درخت لگاتا ہوں تو مٹی اور ریت کسی آندھی کے چلنے سے اُڑ چکی ہوتی ہے۔ کم از کم مجھے نظر نہیں آتی۔ اچھا جب یہ درخت کافی عرصے اسی حالت میں رہ چکتے ہیں اور اُن کی جڑوں کو دنیا کی

ہوا زیادہ سے زیادہ لگ چکی ہوتی ہے تو پوچھی - اور اگر کی روشوں میں لگائے جاتے ہیں - یہ عمل اپریل کے کسی حصے میں ختم ہو جاتا ہے مئی کے مہینے میں جب میں پوچھتا ہوں "چودھری جی! درخت تو نہیں پھوٹے ؟" چودھری کہتا ہے - برسات میں پھوٹیں گے ابھی نہیں جاگے، ابھی ہوش نہیں سنبھالا - ایک سال کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک ہزار میں سے کوئی پانچ چھ درخت ہوش سنبھال رہے ہیں وہ بھی جیسے زندگی اور موت کی کش مکش سے گزر کر میں نے کہا "چودھری تم نے کمال کر دیا - یہ پانچ درخت کیسے اُگے ؟ چودھری نے کہا میں تو بیس سال سے یہی کام کرتا ہوں اور غالباً دل میں کہا کہ اگر ذخیرہ سے سیدھے چالیس پچاس درخت نکلوا کر اسی دن لگوا دوں تو اگلے بیس سال کے لئے کیا کام رہے گا۔

کیا کبھی سرکار نے پوچھا ہے کہ یہ چار ہزار درخت یہاں اور آٹھ ہزار وہاں اور دس لاکھ سارے صوبے میں جو ۱۹۵۰ء میں لگے تھے اُن میں سے کتنے پودے باقی رہ گئے ہیں ؟ اگر سرکار کا پرائیویٹ باغ ہوتا تو ایک درخت کے سوکھنے پر مالی کی جان پر بن جاتی - لیکن سرکار مونث ہونے کے سبب جاں نواز ہوتی ہے کم از کم مالی کی حد تک - پھر بھی کجا کُجا نہم ؟

یہ ساری باتیں تاب تو سین سے پیدا ہوئیں - اگر جسٹس سجاد کو اس دفعہ بریکٹوں کا شوق نہ ستاتا تو نہ تو سین کا سوال اُٹھتا اور نہ بات یہاں تک پہنچتی - اگر کوئی کہتا ہے کہ میرے گھر اور بیٹھک کے درمیان صرف تین فٹ کا فاصلہ ہے تو میں سوچتا ہوں کہ ہمارے ضمیر اور ہمارے شیطان کا درمیانی فاصلہ صرف پانچ چھٹانک چینی ہے یا اُس مختصر صفحۂ قرطاس کا طول و عرض جس پر چودھری جی اور سرکار کا باہمی معاہدہ اس طرح سے درج ہے کہ ہم آپ سے نہیں پوچھیں گے کہ ایم درختوں کے لاشے کہاں گئے ؟ یا وہ فاصلہ جو جسٹس سجاد نے بریکٹوں کے اندر ڈالے

اور بریکٹوں کے باہر والے مضمون کے درمیان رکھا ہے مثلاً جب وہ کہتے ہیں "ہمارا سماجی ماحول" اور بریکٹوں میں لکھتے ہیں "پنبہ کجا کجا نہم" تو وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا سماجی ماحول زخموں سے چھلنی ہو گیا ہے۔ آپ تو ممکن ہے یہ خیال کریں کہ اس طرح سے قاب قوسین کا ذکر کرنا کوئی گناہ نہیں ہے مگر مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں کوئی اور یہ نہ کہہ بیٹھے کہ دیکھو اس کو قاب قوسین جیسے مقدس جملے سے چلنی کا راشن یاد آتا ہے یا یہ نہ سوچنے لگے کہ قوسین بھی ضرور "کوئی ہوسی تا" پچھلے سال میں نے مجنوں کی زبانی لیلیٰ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ ع

ظالم بہت ہیں لوگ ترے شہر کے جاناں

مگر وہ ظلم تو صرف پتھر مارنے تک محدود تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تیرے شہر کے لوگ میرے الفاظ میں معنی بھی ڈھونڈیں گے اور اس کی تلاش میں ہمارے گاؤں کے ملا کی طرح سہ آتشہ عمل کام میں لائیں گے۔ جس ملا کا ذکر میں کرتا ہوں۔ وہ عالم تھا فارسی اور عربی پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے مجھے شعر کی اُن تین صنعتوں سے آگاہ کیا۔ جن کو تقلیب، تجنیس اور تردیف کہتے ہیں۔ تقلیب کے عمل سے لفظ اُلٹ جاتا ہے اس لیے انقلاب کسی چیز کے اُلٹنے کو کہتے ہیں مثلاً عمل تقلیب سے مُوش دم۔ واو۔ ش، کا لفظ شوم بن جاتا ہے ویسے چوہے کنجوس نہ ہوں تو چور ضرور ہوتے ہیں۔ دوسرا عمل تردیف کا ہے یعنی مترادف ہونا۔ دو ہم معنی الفاظ کو مترادف کہتے ہیں۔ بخدا میں آپ کو پڑھانے کی کوشش نہیں کر رہا مگر اس بزم میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو وکلاء کی طرح صرف انگریزی پڑھتے رہے ہوں گے اور اُردو فارسی سے اُن کا سوتیلی ماں کا سا سلوک رہا ہو گا یعنی وہ جیسے سوتیلی ماں ہوں اور اردو سوتیلا بیٹا۔ اور اگر اُردو مؤنث ہے تو سوتیلی بیٹی۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ اردو مذکر ہے یا مؤنث، البتہ یہ جانتا ہوں کہ اگر کسی پٹھان نے کہا کہ میں نے اردو سیکھا ہے تو اُردو دان پنجابی

اِس پر ہنسے گا اور کہے گا کہ اِس کو اُردو سیکھنا نہیں چاہیئے، سیکھنی چاہیئے بلکہ "سیکھنی چاہی دی لے"۔ مگر آپ کچھ کہیں پٹھانوں کی اردو گرامر میں ایک ثابت قدمی اور سادگی ہے ایک استقلالِ آئین او رقاعدہ کلیہ ہے وہ یہ کہ پٹھان مرد صرف مذکر کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور پٹھان عورت صرف مؤنث کا۔ اور اب تو چونکہ پٹھان بھی مونچھیں نہیں رکھتے اس لیے مرد عورت کی تمیز صرف اُن کی گفتگو میں تذکیر و تانیث کے استعمال سے ہوتی ہے مثلاً پٹھان مرد کہتا ہے کہ میرا بیگم بھی اُس پارٹی میں گیا تھا اور پٹھان عورت کہتی ہے کہ دیکھو جمعدارنی! میری صاحب ہائیکورٹ سے آ گئی ہے یا نہیں"۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ میری بیوی نے کہا ہوگا۔ آخر پٹھان جج اور بھی تو ہیں اور ججوں کو چھوڑ کر وزیروں کے قصّے بھی تو ہیں۔ میرے بھائی جب پہلی دفعہ وزارت کی سزا میں حلفِ وفاداری اُٹھا رہے تھے تو اُن کے انتخابی حلقے کی ایک تعلیم یافتہ خاتون ریڈیو سُن رہی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حلفِ وفاداری انگریزی میں تھا۔ انگریزی میں حلف اُٹھایا جاتے تو اُسے آدمی توڑ بھی سکتا ہے۔ یہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ حلف "آئی" سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی مَیں۔ اِس کے بعد حلف لینے والے کا نام آتا تھا اس طرح سے کہ "مَیں، گُل محمد"، حلف اُٹھاتا ہُوں کہ اپنے دوستوں اور پارٹی والوں کے ساتھ وفادار رہوں گا۔ وغیرہ وغیرہ"۔ ایسا ہی کچھ تھا۔ ویسے گُل محمد کسی پیغمبر یا وزیر کا نام نہیں ہو سکتا مگر ڈر کے مارے کسی کا اصلی نام نہیں لیتا کہ وہ ناراض نہ ہو یا اُس پر ایبڈو EBDO کا نوٹس جاری نہ ہو جائے۔ یہ بھی ایک تماشا تھا۔ آئے دن ہم ریڈیو پر سنتے تھے "آئی گُل محمد۔ آئی گُل نشاں۔ آئی لاڈو خانم، مگر وہ تو اک تماشا تھا اب اس کا گلہ بن گیا۔ آج کل گلہ بھی رجسٹری ہوتا ہے اس کو ایبڈو کا نوٹس کہتے ہیں۔ گلہ کچھ اس طرح کرتے ہیں "دیکھئے نا سائیں میرے! آپ نے دورانِ وزارت میں یہ کیا تھا، وہ کیا تھا۔ حلفِ وفاداری میں تحریف کرکے دوستوں سے وفاداری کا محاذ

قائم کر لیا تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ غالب نے جب یہ شکایت کی تھی کہ گلا کا تماشہ کیوں بناتے ہو تو وُہ اِسی ایپیڈو کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیونکہ ایک نسخے میں اِس طرح بھی لکھا ہے۔ ؎

جمع کرتے ہو کیوں وزیروں کو
اک تماشا ہُوا گلہ نہ ہُوا

تو میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ جب میرے بھائی حلفِ وفاداری اُٹھا رہے تھے تو اُن کے انتخابی حلقے کی ایک خاتون ریڈیو سُن رہی تھی۔ چند روز بعد یہ بتانے کے لیے کہ میرے پاس ریڈیو ہے اور میں پڑھی ہوئی بھی ہُوں۔ اُنھوں نے میرے گھر آکر یہ کہا "میں نے سارا قصّہ ریڈیو پر سنا ہے۔ پہلے جب ریڈیو نے کہا کہ" آنی ملک رحمٰن" تو میں سمجھ گئی کہ ملک رحمٰن آگئی۔

مَیں مترادف الفاظ کی مثال دے رہا تھا مگر مؤنث اور پٹھانوں وزیروں کے جھگڑے میں خواہ مخواہ پڑ گیا۔ وکیلوں کو چھوڑ کر عام لوگ تو مترادف الفاظ کو اتنی جلدی سمجھتے ہیں کہ بعض اُن میں سے عدالت کو بے انصافی کا مترادف تصور کرتے ہیں اچھا تو تقلیب اور تردیف کے بعد نمبر اصل تجنیس کا ہے یعنی الفاظ کا ہم جنس ہونا اور واضح رہے کہ اُس کا جنسی تعلق سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہم جنس الفاظ وُہ ہیں جن کے اگر نقطے ہٹا دیے جائیں تو ایک سے نظر آتے ہیں۔ جیسے نیشہ اور بیشہ۔ اس تشریح کے بعد ہمارے گاؤں کے مُلّاں نے یہ شعر پڑھا ؎

بتقلیب و بہ ترویف و بہ تجنیس
ز رُوئے یار خواہم ضد ِ شرقی

یعنی اِن تین عملوں کے ذریعے میں اپنے دوست کے رُخسار سے ضد شرقی مانگتا ہوں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کیونکہ یہ ضد کی بات ہے۔ ضد کی بات ہو تو آپ

جلدی سمجھ جاتے ہیں۔ غالبؔ بھی محبوب کی ضد سے پریشان رہ چکے ہیں۔ ع

ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں

غرض میں شرقی کہوں تو آپ ضد سے غربی کہیں۔ پس ضد شرقی ہوئی غربی۔ اور غربی عمل تقلیب یعنی الفاظ کے اُلٹانے سے دیغر بن جاتا ہے جو ربیع کا ہم جنس ہے اور بہار کا مترادف ہے۔ بہار اور نہار ہم جنس ہیں۔ نہار اور یوم مترادف یعنی ہم معنی ہیں۔ یوم کو اُلٹا دیں تو مُوتے بن جاتا ہے یعنی بال جسے عربی میں شعر کہتے ہیں شعر عمل تجنیس سے شعر بن گیا جس کو کبھی بیت بھی کہتے ہیں۔ بیت کے معنی گھر بھی ہیں اور گھر کو دار بھی کہتے ہیں۔ دار کو اُلٹایا تو راد بن گیا۔ راد اور زاد ہم جنس ہیں۔ زاد و راہ تو آپ نے سُنا ہوگا۔ اِس کو توشہ بھی کہتے ہیں۔ توشہ کے نقطے ہٹا دیں اور ایک نقطہ "ب" بنانے کے لیئے نیچے ڈالیں تو بوسہ بن جاتا ہے۔ گویا شاعر دوست کے رُخسار سے بوسہ مانگتا ہے۔ شرم

مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے سادہ خیالات کو سمجھنے کے لیئے نہ خیالات کو اُلٹانے کی ضرورت ہے نہ یہ جائز ہے کہ جب میں توشہ کہوں تو آپ اُس سے بوسہ سمجھیں، ویسے آپ کو بوسہ چاہیئے تو کس نے روکا ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں یہ ایک تسلسل خیالات کی مجبوری ہے اور تسلسل خیال ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس میں خیالات امواج بحر کی طرح ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ موجیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو اُن سے تمنائیں ٹوٹ کر پھوار کی طرح برستی ہیں۔ یہ ایک اور نفسیاتی کیفیت ہے جو آپ کی توجہ اور ہمدردی کی طالب ہے سے

تُو ہے مرے افسوسِ گریبانِ تمنّا
مُجھ سا بھی نہ کوئی ہو پشیمانِ تمنّا

اب میں اپنی پشیمانیوں کا علاج کروں جو حسبِ سجاد کے مُطابق بڑے مزے

کی ہیں یا آپ کی پریشانیوں کا جو اس مزے کے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں

”پنبہ کجا کجا نہم“

مَیں نے آخر کیا قصُور کیا ہَے ؟

افکارِ پریشاں

(قسط سوم)

میرا تصوّر — !

"مجھے شرم آتی ہے مگر ......"

صاحبِ صدر، خواتین و حضرات!

اگرچہ آج افکارِ پریشاں کا تیسرا جنم دن ہے مگر آپ کی اجازت سے میں اسے برسی کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اب فاتحہ پڑھنے کا وقت آگیا ہے۔ خدا کسی کے خیالات کو تین سال سے زیادہ پریشان نہ رکھے۔ تین سال کے بعد دونوں میں سے ایک کو دفن کر دینا چاہیئے یا اُن افکار کو جو پریشان ہیں یا اُس کو جو اُن سے پریشان ہے۔ پہلی صورت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے کیونکہ دوسری صورت میں میں خود شریکِ جنازہ نہیں ہو سکوں گا۔ اس کی تو کوئی بات نہیں مگر ایک ایسے ثواب سے جس کا میں جائز وارث ہوں، محروم رہ جاؤں گا۔ اور اگرچہ آج کی تقریر کا عنوان بھی دستورِ سابق کے مطابق افکارِ پریشاں ہے لیکن مناسب ہو گا کہ اس کا دوسرا نام یہ رکھیں "مجھے شرم آتی ہے مگر ......" مگر کے آگے کئی نقطے ہیں اس لیئے شرم کئی باتوں سے آسکتی ہے۔ اِک ذرا اِنسان میں شرمانے کی ہمت چاہیئے۔ سب سے پہلے جب میں نے یہ فقرہ سُنا تھا تو میں شام ڈھلنے کے بعد

اندھیرے میں سڑک پر جا رہا تھا۔ اندھیرے میں سے آواز آئی اور آواز کے پیچھے ایک آدمی کی شکل نظر آئی۔ اچھا خاصا نوجوان تھا، کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے۔ اُس نے کہا "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر بیوی کو مرض دق ہے اور علاج کے لیے پیسہ نہیں" میری جیب میں پانچ روپے تھے مستحق تو زیادہ کا تھا، مگر وہی دے دیئے۔ یہ پانچ روپے کا اعلان اس لیے کرتا ہوں کہ اگر آپ میں سے کسی نے مجھ پر اندھیرے میں حملہ کیا تو پانچ روپے سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ اور پھر بائی الگ ہو گی۔ اب تو مجھے پانچ روپے رکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مجھے پھر اس سڑک پر تقریباً اُسی وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ اندھیرے میں سے پھر آواز آئی "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر میرے بچے کو فالج ہے۔ دو سال کا تھا جب اُس کی ماں چل بسی تھی" میں نے شرمانے کی آواز پہچان لی اور کہا کہ اُن کو تو کچھ دن پہلے دق کی بیماری تھی نا؟ اس نے بھی میری آواز پہچان لی اور کہا "مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ وہی ہیں میں معافی چاہتا ہوں"

اس کے بعد کئی سال تک یہ آواز نہیں سُنی۔ اب کوئی تین ہفتے ہوئے ہوں گے کہ ایک ہشت سالہ بچے سے پھر یہی فقرہ سُنا۔ اُس کا نام اسد ہے۔ میرے بڑے بھائی کے بڑے لڑکے کا بڑا لڑکا ہے۔ اُس نے کچھ جنتر کے بیج زمین میں پھینکے تھے جو مہینہ بھر میں سات آٹھ فٹ اونچے ہو گئے۔ بعض پودے جلد اونچے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان بھی جلدی اونچے ہو جاتے ہیں مگر جنتر کی جڑ استوار نہیں ہوتی۔ کسی بھی ایسی چیز کی جڑ استوار نہیں ہوتی جو جلدی سے اُوپر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کو بھی اپنی جڑیں، اپنی بنیادیں استوار کرنی چاہئیں۔ آپ تو اب ماشاء اللہ اُونچے درختوں کی طرح ہیں جن کی اصلاح آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ اپنے بچوں کی بنیادیں راستی پر رکھیں۔ اُن کی نشوونما میں کوئی ٹیڑھی ٹہنی نظر آئے تو اُسے

کاٹ دیں۔ درخت سیدھا اُٹھے تو خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے سوچا ہے کہ سیدھے کے سائے محاورے نیکی کے ہیں۔ مثلاً سیدھا گھر خدا کا، سیدھی بات کرنا۔ سیدھی چال چلنا اور ٹیڑھا پن کے سائے محاورے بدی کے ہیں مثلاً ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنا، ٹیڑھی چال اور ٹیڑھی کھیر۔ اور اگر میرے افکار یونہی پریشان رہے تو تھوڑے دنوں میں فرنی بھی ٹیڑھی ہو جائے گی۔ الحذر ائے فرنی، فرعونیاں۔ یہ مصرعہ لاجواب ہے ابھی ابھی طبیعت نے حاضر کیا ہے۔ دوسرا مصرعہ اس وقت غیر حاضر ہے اور بات یہ ہے کہ فرعونیت کی فرنی کھانے والوں پر شعر کہنا ٹیڑھی ترین کھیر ہے۔ لہٰذا آپ یہ سمجھیے کہ دوسرا مصرعہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہو گیا۔

بات جنتر کے پودوں کی ہو رہی تھی جو چھوٹے اسد نے کاشت کیے تھے، وہ مجھے جیجو (جی جو) کے نام سے پکارتا ہے۔ اِس لفظ کا نہ تو کوئی ماخذ ہے اور نہ اِس کے کوئی معنی ہیں۔ شروع میں ایک بچے نے بولنے کی ابتدا اِس طرح کی کہ مجھے جیجو کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد سارے بچے سُنتِ طفلاں کے طور پر یہی نام دُہراتے رہے ہیں۔ دوسرے لڑکے نے نعم البدل کے طور پر مجھے بپون کہا (ب، پ، و، ن) والد مرحوم نے سُنا تو فرمایا کہ بچہ بوُن کہنا چاہتا ہے جو کسی زبان میں بندر کو کہتے ہیں۔ ساتھ ہی فرمایا کہ لڑکے ہوشیار ہوتے ہیں پہچان لیتے ہیں۔ لڑکا سچ مچ ہوشیار تھا۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جب ذرا زیادہ ہوشیار ہوا تو بپون کہنا چھوڑ دیا مگر جیجو کا نام اب تک میرے ساتھ لگا ہوا ہے۔

بعض لوگ ہر لفظ کا مآخذ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ اُن دنوں میں جب مجھے لڑکے نے جیجو کہنا شروع کیا آپ کیا کام کرتے تھے۔ میں نے کہا "سیشن جج کا کام کرتا تھا" کچھ سوچ کر اُس نے کہا "دیکھو جی ---! کمال کیا۔ میں نے پوچھا "کس نے کمال کیا؟" اس نے کہا "دیکھو جی! بچے! اپنے ساتھ

علم اللدنی سے کرآتے ہیں۔ سچ تو آپ ننھے ہی۔ آپ کے بچّے نے دونوں جیموں کے درمیان ایک یائے معروف اور ایک واوِ مجہول ڈال دی تاکہ آپ معرُوف طبقوں میں مجہُول رہیں اور اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا یعنی جاہلوں میں اپنے کو بے بس دیکھو تو کہو میرا تم پر سلام۔ کیونکہ اسی میں سلامتی ہے۔

القصّہ اسد دیکھتا تھا کہ میں پودوں کا شوق رکھتا ہُوں اور ایک جگہ سے نکال کر دُوسری جگہ لگاتا ہُوں۔ یہاں یہ بتانا ضرُوری ہے کہ جنتر اُن پودوں میں سے نہیں جو ایک جگہ سے نکال کر دوسری جگہ لگائے جا سکتے ہیں مگر اسد کو یہ معلوم نہیں اس نے میری غیر حاضری میں گھر والوں کو کہا "مجھے شرم آتی ہے جیجو کو کہتے ہُوئے مگر وہ جنتر کے پودے کافی بڑھ گئے ہیں۔ اگر جیجو کہیں لگانا چاہیں تو بے شک لگا دیں" پھر جب یہ سُن کر میں ہنسا اور پودے استعمال نہیں کیئے تو اُس نے ایک دن کہا۔ "مجھے شرم آتی ہے جیجو سے کہتے ہُوئے مگر صحن میں مکھیاں بہت ہو گئی ہیں۔ جیجو سے کوئی کہے کہ ان کو پیسے دے کر رخصت کر دیں"

میں نے سوچا یہ فقرہ ہر دُشوار مقام پر مُشکل کُشا بن سکتا ہے اور کیوں نہ آج میں بھی اِس پر تکیہ کروں۔ اس لیئے مجھے یہ کہتے ہُوئے شرم نہیں آتی کہ مجھے شرم آتی ہے۔ ہر سال یہ کہتے ہُوئے کہ میں یہ تقریر کس بات سے شروع کروں، کس بات پر ختم کروں اور بیچ میں کون سا مرثیہ پڑھوں۔ کیونکہ جسٹس سجّاد احمد جان نے چھ مرثیے دُتے ہیں۔ ان عنوانوں کو مرثیہ اس لیے کہتا ہُوں کہ وہ اولاً آخراً، ظاہراً باطناً، طوعاً و کرہاً جبراً و قہراً، القصّہ کلیتہً رونے کے مضمون ہیں۔ مثلاً قوم کے نام خطاب، یادِ ایامِ رفتہ اور رازِ دل کس کو سُناؤں کوئی سُنتا ہی نہیں۔ عنوان کیا ہیں ببول کا خارستان ہیں جدھر بھی قدم رکھوں کانٹے چبھتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا اسی جنگل میں تھوڑے دن ہُوئے قیس عامری ننگے پاؤں دوڑتا پھرتا تھا۔ پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لیئے بیٹھا تو

لیلیٰ کا ناقہ نظر سے غائب ہو گیا ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ مَیں بھی قیس عامری کی —— میرا مطلب پاگل ہونے کا نہیں کانٹا نکالنے کا ہے۔ مگر اتنی فرصت کہاں۔ آپ کو میرے پاؤں کے کانٹوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا اور کانٹوں سے بچنے کے لیے آپ نے بُوٹ پہن لیے۔ تو مَیں خارِ پا کی بجائے خارِ پہلو بن جاؤں گا جس کی کھٹک سے آپ کا دل بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

اگلا مرثیہ ہے حالاتِ حاضرہ کے تقاضے۔ ایسے مزے سے کہا ہے جیسے کوئی کہتا ہے جوانی کے مزے یا الہ آباد کے امرُود۔ سجّاد صاحب بخُوبی جانتے ہیں کہ حالاتِ حاضرہ کا ایک تقاضا میری قضا تک پہنچ گیا ہے۔ تقاضے کے لفظ پر تو مجھے محترم مُدیرِ "چراغِ راہ" کا وُہ سوال یاد آیا جو اُنھوں نے ازراہِ استفسار نہیں بلکہ ازراہِ زینتِ رسالہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اُردو زبان کا موجُودہ رسم الخط کسی تبدیلی کا متقاضی ہے؟ مَیں نے جو جواب دیا اس کی نقل تو میرے پاس نہیں ہے مگر وُہ کچھ اِس طرح پر تھا کہ اُردو رسم الخط نے خُود تو کوئی تقاضا نہیں کیا کہ مجھے بدلا جائے مگر آپ کی یہی رضا ہے تو پھر اُردو کی قضا ہے۔ البتّہ انسان کی فطرت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ چیزیں ہمیشہ بدلتی رہیں۔ کوئی اس کو جدّت کہتا ہے کوئی بدعت اور کوئی تو انقلاب کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ میرے دوست پروفیسر محمد منوّر نے جو زیادہ انقلاب کے متحمّل نہیں ہو سکتے، رسم الخط میں اگر نہیں تو طریقۂ تحریر میں اتنی تبدیلی کر دی کہ جہاں آپ اور مَیں دائیں جانب کو

لکھتے ہیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف، وہاں وُہ جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتے ہیں اور آدھا صفحہ لکھ کر شمال مشرق سے جنوب مغرب کا رُخ کرتے ہیں۔ اب چُونکہ آپ کو اور کوئی تبدیلی نہیں سُوجھتی، کیونکہ یہ بھی حبسِ سجاد کے حالاتِ حاضرہ کا تقاضا ہے، اور شادیاں بھی چار سے یک لخت ایک ہونے پر آپ "کُلُّ جَدِیدٍ لَذِیذٌ" کی لذّت سے محروم ہو گئے ہیں، اس لیے عروسِ اُردو کو شریکِ حیات سمجھ کر اپنے جنسی میلانوں کی تسکین کے لیے اس کو رومن اُردو کا فراک پہنائیں جن لوگوں کو آپ کی اور میری طرح صرف ایک شادی میسر ہوتی ہے، خواہ اِس وجہ سے کہ وُہ چار مکان نہیں رکھتے، خواہ اس لیے کہ ایک ہی زبان رکھتے ہیں اور وہ بھی مُنہ کے اندر، جب شاعر نے یہ کہا تھا ؏

مَیں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہُوں

تو مَیں نے اعتراض کیا کہ زبان تو ہوتی ہی منہ میں ہے، سر میں تو ہوتی نہیں، لہٰذا یہ مصرع غیر ضرُوری ہے تو اُس نے دوسرے مصرع میں جواب دیا کہ بعض لوگوں کی زبان مُنہ سے باہر ہوتی ہے اور اگر میری بھی باہر ہوتی تو گذارشِ احوال کرتا اور کاش پوچھو کی ضرُورت نہ رہتی کیونکہ مَیں بغیر پُوچھے ہی مدّعا بیان کر دیتا۔

تو مَیں آپ کو بصیغۂ راز بتا رہا تھا کہ جن لوگوں کو ایک ہی بیوی مُیسر ہے وُہ اُسے کبھی فراک پہناتے ہیں اور کبھی ساڑھی اور اس طرح سے شکل میں جدّت پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی بال بھی کٹوا دیتے ہیں اور اگر نہ کٹوائیں تو کبھی تصویر کھُلے بالوں میں کھنچواتے ہیں اور کبھی بال ایسے سخت بندھے ہُوئے نظر آتے ہیں جیسے ان پر استری کی گئی ہو۔ ہم نے جب پہلی دفعہ اپنی بیگم صاحبہ کے لیئے ساڑھی خریدی تھی تو یہ نہیں جانتے تھے کہ کتنے گز کی ہوتی ہے۔ مقامی درزی نے کہا کہ بارہ گز ہونی چاہیئے کیونکہ اِس میں کئی لپیٹ ہوتے ہیں۔ اُس نے یہ نہیں سوچا کہ ساڑھی کا مضمون

اگر موٹا ہو تو بارہ کی بجائے چھ لپیٹ آئیں گے۔ بہرحال بارہ گز کپڑا خریدا اور پھر باندھنے کے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلایا کیونکہ اُن دنوں ساڑھی کا تصور بغیر لیڈی ڈاکٹر کے نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ڈاکٹرنی جلدی میں کسی مریضہ کو شلوار قمیص میں دیکھنے چلی گئی تو مریضہ کے رشتہ داروں نے پوچھا کہ "ڈاگ دار" خود کیوں نہیں آئی۔ دائی کو بھیجنے کا کیا مطلب۔ جب اس نے بتایا کہ میں ہی ڈاکٹر ہوں تو انھوں نے شلوار کے پائنچوں سے قمیص کی گردن تک مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر کہا "پر آپ نے ساڑی تو نہیں پہنی"۔ اُس نے شک رفع کرنے کے لیے کہا کہ ساڑھی ہم اُس وقت پہنتے ہیں جب مریض کی حالت خطرناک ہو۔

وُہ اچھے دن تھے اب تو ساڑھی قریباً گم ہو گئی ہے۔ اب اس کو دھوتی کہتے ہیں۔ اس لیئے بھی دل پہننے پہنانے کو نہیں چاہتا۔ مگر اُن دنوں اَوجِ حسُن کا ہُما ساڑھیوں پر ہی گزرا کرتا تھا اور وُہ خواتین جو پردے کی سرحد پر تھیں اگر کبھی اُنھیں سرحد سے گزرنا ہوتا تو پاسپورٹ کے طور پر ساڑھی پہن لیتی تھیں۔ ایک خاتون خاوند کی غیرموجودگی میں سفر کر رہی تھیں۔ کسی جنکشن پر جہاں گاڑی اُن سے اگاڑی نکل گئی اور اُن کو رات ریٹائرنگ رُوم میں گزارنی پڑی۔ ریٹائرنگ رُوم میں پہنچ کر اُنھوں نے بُرقع پھینک دیا۔ ساڑھی پہن لی اور سٹیشن ماسٹر کو بلا کر کہا کہ ہمارے لیئے کھانے کا انتظام کرو۔ غالباً سٹیشن ماسٹر کو اگر بُرقع کے اندر سے مخاطب کیا جاتا تو وُہ یہ نہ سمجھ سکتا کہ ایک لیڈی اُس سے مخاطب ہے وہ یہ سمجھتا کہ کوئی عورت بول رہی ہے۔ وہی قصّہ ہوتا کہ ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں۔ دوسرا مصرعہ غالبؔ کے غیرمطبوعہ کلام کے تھیلے سے ملا ہے "ہم بھی بُرقع میں شان رکھتے ہیں۔" مگر وُہ بارہ گز کی ساڑھی زیادہ عرصے نہیں رہی مُشکل یہ تھی کہ ساڑھی باندھنے کے لیئے دو عورتیں رکھنی پڑتی ہیں۔ ایک خادمہ ایک سِرا لے کر بیگم صاحبہ کے قریب کھڑی ہو جاتی اور دُوسری خادمہ دُوسرا

سرا یکڑ لیتی اور بارہ گز قطر کا دائرہ بیگم کے گرد بناتی۔ یہ دائرہ ہر چکر پر گھٹتا جاتا مگر تیسرے چوتھے چکر میں بیگم صاحبہ کو شک ہو جاتا کہ اُوپر فضا میں کوّا گزر گیا ہے اس لیئے آواز دے کر مجھے بُلاتیں اور کبھی میں بھی ساڑھی کی لپیٹ میں آ جاتا۔ اتنے تردّد کے باوجود لیڈی ڈاکٹر جب آ کر دیکھتی تو کبھی مُسکراتی اور کبھی ہنس دیتی۔ اِس لیئے اگلے سال اُس سے لڑکیوں کے لیئے دو تین جوڑے شلوار قمیص کے بنا دیے گئے میں تو اپنے لیئے ایک پاجامہ سوٹ بنوانا چاہتا تھا مگر درزی نے مُخالفت کی اور کہا کہ یہ بہت زنانہ کپڑا ہے۔

ہمارے خاندان میں پُشت در پُشت بلکہ ایک ہی پُشت میں بھی بزرگوں کے کپڑے پہننے کا رواج تبرّکاً قائم ہے۔ ۱۹۳۵ء میں میری ایک لڑکی لاہور میں مسیح و مریم کے کانونیٹ میں پڑھتی تھی۔ وہاں اُس کو پہننے کے لیئے شاہی نیل کا یونیفارم ملا تھا۔ جب وُہ یونیفارم کے سائز سے بڑھ گئی تو اُس کے چھوٹے بھائی نے اُسے پہننا شروع کر دیا۔ وُہ اُس کانونیٹ میں تو نہیں تھا مگر کپڑا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ ساری سردیوں میں کام آیا۔ جب وہ بھی بڑھ گیا تو قریباً سات سال کے بعد اُس کے چھوٹے بچے نے پہنا۔ میں بچوں کے نام اِس لیئے نہیں لے رہا کہ اگر سکولوں اور کالجوں میں انھیں شریر بچے چھیڑیں تو وہ کہہ سکیں گے کہ یہ میرے دوسرے بھائی کے متعلق لکھا ہے۔ سکولوں اور کالجوں کا یہ حال ہے کہ جب کبھی میں اپنے والد کے پُرانے بُوٹ پہنتا تو جماعت کا خُود ساختہ لیڈر میری ہنسی اُڑاتا تھا کہ اس بیچارے کو نئے بُوٹ نہیں ملتے لیکن وہ خُود اپنے دادا کے وقت کی مشہدی لنگی پہن کر آتا اور میں صرف مُسکراتا تو وہ کہتا تھا کہ اگر ہم بزرگوں کا نام روشن نہ کریں تو اور کون کرے گا۔ القصّہ اب پچھلے سال اُنیس سو ساٹھ (۱۹۶۰) عیسوی میں پچیس سال گزرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وُہی یونیفارم میرے بڑے بھائی کے

بڑے لڑکے کے بڑے لڑکے نے پہنی ہے۔ وہی اسد جس کو بعض باتیں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ اگلے دن اسد کے چھوٹے بھائی "مظہر" نے ایک نئی قسم کا کُرتہ پہنا تھا اور بڑے سٹائل سے میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے باپ نے کہا مبارک ہو۔ میرے سوال پر بتایا کہ یہ کپڑا رینکین کی دکان کا ہے۔ میں نے پُوچھا کہ رینکین تک مظہر کیسے جا پہنچا۔ اس نے بتایا یہ وہی قمیص ہے جو آپ نے ۱۹۴۸ء میں اپنے لیئے رینکین سے بنوائی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں جب اُس کی آستینیں پھٹ گئیں تو آپ نے یہ مجھے عنایت کی تھی میں نے آستینیں اُلٹ کر اسے استعمال کیا مگر اس سال دوسری طرف سے بھی آستینیں پھٹ گئیں۔ لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ اُردو رسم الخط کی طرح یہ قمیص بھی تبدیلی کی متقاضی ہے اور کانٹ چھانٹ کر مظہر کے لیئے کُرتا بنوا دیا۔

میرے خیال میں پروفیسر خورشید احمد کو متقاضی کی بجائے متحمل کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ قمیص اور یونیفارم تو تبدیلی کے متحمل تھے لیکن کیا اُردو رسم الخط بھی اتنی تبدیلی برداشت کر سکتا ہے کہ اُسے رومن کا جامہ پہنایا جائے۔ مگر جامے کی تشبیہ یہاں غلط ہے، اُس کا تو چہرہ ہی بدل جائے گا۔ یہ محض لباس کا بدلنا نہیں ہے رسم الخط کو تو زبان سے وہ تعلق ہے جو تن کو جان سے ہے۔ میں نے فراک کا ذکر اِس لیئے کیا تھا کہ یہ اہلِ مغرب کا مخصوص لباس ہے اور غالباً اُردو کو رومن بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے مغرب کے لیئے دلپذیر بنایا جائے مگر آپ بھُول رہے ہیں کہ کسی زبان کی اہمیّت اُس کی اپنی خوبصورتی سے نہیں بڑھتی، اُس کے بولنے والوں کی خُوبصُورتی سے بڑھتی ہے۔ جب آپ اخلاقی طور پر صحتمند ہو جائیں گے تو آپ کی قومیت کا اعتبار قائم ہو جائے گا اور دنیا آپ کی اردو بھی سیکھے گی اور اِس کے رسم الخط کے نخرے بھی اُٹھائے گی۔ کافِ کابل اور قاف قندھار

کے باریک فرق کو دیکھ کر لوگ کہیں گے سبحان اللہ! محض حروف کے امتیاز میں یہ لوگ کتنی دُور چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی اپنی اصل پر نظر ہے ورنہ کافِ کابل کے بجائے کاف کشمکش اور قافِ قندھار کی بجائے قاف بدقسمت زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ یہ کشمکش جو ہم بلخ اور باختر کی جانب سے اُٹھتی ہوتی دیکھتے ہیں واقعی قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ الغرض جب ہم صحت مند ہو جائیں گے تو اُردو کی ساکھ اتنی بڑھ جائے گی کہ گندھارا سنگھ بھی تعریفی لہجے میں کہنے لگے گا "اُردو دیاں نوجاں آیاں۔"

اِسی طرح خودی کا لفظ لیجئے۔ جب اُردو بولنے والے مُستقل مزاج ہو جائیں گے تو دنیا والے خودی کے لفظ کو سُن کر یہ اعتراض نہیں کریں گے کہ یہ نہ تو معروف ہے نہ مجہول۔ بلکہ یہ کہیں گے کہ خودی میں جو خودداری پوشیدہ ہے وہ خودی کے واؤ کے برعکس سُننے میں آتی ہے دیکھنے میں نہیں آتی۔ مگر اِس وقت تو آپ کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اِس وقت اگر آپ نے پورا رسم الخط بدلنے کا نخرا کیا تو اُس کی حیثیت ایک شُتر غمزے کی سی ہو گی۔

اخلاقی صحت کا ذکر کرتے ہوئے مجھے ایک خوب صورت فقرہ یاد آیا جو اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے "اسوۂ حسنہ یعنی اعلیٰ نمونہ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس اعلیٰ نمونے کے مالک نے اپنے کردار کے زور سے عرب کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ شاید آپ نے کبھی قرآن میں بھی پڑھا ہو کہ آپ کے لیئے رسولِ خدا کی ذات میں کردار کا ایک اعلیٰ نمونہ موجود ہے (لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ") ویسے تو میں نے بھی کبھی اِس پر زیادہ غور نہیں کیا تھا مگر چودھری نذیر احمد خاں کبھی کبھی کوئی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں اور میری جان پر بن جاتی ہے وہ تو غم دے کے بھُول جاتے ہیں یا لاہور چلے جاتے ہیں۔ مجھ کو

ایبٹ آباد کا پاس رہتا ہے۔ عید میلاد سے ایک دن پہلے تشریف لائے اور کہا کہ یہاں میلاد کا جلسہ کرنا ہے اور لوگوں کو سمجھانا ہے کہ کردار کا مُوڑ کیا ہوتا ہے۔ میں تقریر کروں گا آپ کرسیٔ صدارت پر بیٹھ کر خاموش خاموش کہیں گے۔ پھر میں خاموش ہو جاؤں گا اور آپ بولیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ نازک مضمون ہے، یہ مشکل زمین ہے۔ بلکہ یہ وُہ آسمان ہے جہاں پرواز کے پر جل جاتے ہیں اور لوگ میرے الفاظ کے قدرتی بل نہ سمجھ کر بعض دفعہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ کبھی اخبار والے بھی انگریزی کا ترجمہ غلط کر کے اُن کو ناراض کر دیتے ہیں۔ مثلاً میں نے کسی جگہ یہ کہا تھا کہ تم کے ایک علی دوست نے اپنے دوست دوست علی سے شکایت کی کہ یہاں عالم اور واعظ بہت آئے مگر ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ خدا بڑا ہے یا اُس کا رسولؐ یا رسولؐ کا داماد علیؓ۔ دوست علی نے اپنے دوست علی دوست سے کہا۔ علی دوستا! ان مشکلات میں نہ پڑو۔ یہ سارے ایک ہی ٹبّر یعنی خاندان کے ہیں۔ تقریر انگریزی میں تھی۔ ترجمہ کرنے والے نے لکھا "یہ سارے بزرگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں"۔ جس پر قدرتی طور پر نعوذ باللہ کہا گیا پھر میں نے چودھری نذیر احمد خاں سے کہا، ہماری ساری روایات بھی تو ہماری سیرت کی تشکیل میں مد نہیں ہوتیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے عہد میں لوگوں نے ایک گورنر سعید بن عامر کی شکایت کی کہ ایک تو وہ صبح سویرے سورج چڑھنے سے پہلے اپنا کاری کام شروع نہیں کرتا، دوسرے رات کو اُن کی پکار سُن کر باہر نہیں آتا، تیسرے ہفتے میں ایک دن چھٹی بھی کر لیتا ہے اور پھر گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ گورنر نے پہلے اعتراض کا یہ جواب دیا کہ میرے گھر والوں کے پاس کوئی خادم نہیں۔ اس لیے اپنے لیے آٹا خود گوندھتا ہوں اور روٹی پکانے کے بعد کام شروع کرتا ہوں۔ ممکن ہے روٹی پکا کر کھا بھی لیتا ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بھئی یہ تو ناجائز نہیں۔ آٹا گوندھنے کا ذکر

قرآن میں "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ" یعنی شراب اور جُوئے کے ساتھ تو ہوا نہیں بلکہ آٹا گوندھنے کا ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔ پھر آٹا گوندھنے میں کیا حرج ہے؟ شکایت کنندگان نے کہا چلو نہ سہی۔ ویسے کوئی ضروری تو نہیں کہ کھانا کھا کر ہی کام شروع کیا جاتے۔ رسول اللہؐ کو بعض دفعہ تین تین دن کھانا میسر نہیں ہوا تھا اور پھر گھر والوں کے پاس خادم نہیں تو بیوی آٹا گوندھے۔ گورنر صاحب خود کیوں گوندھتے ہیں۔ یہ آخری دو تین باتیں اُنھوں نے نہیں کہی تھیں میں نے اپنی طرف سے غصے میں ایزاد کی ہیں۔ مگر یہ ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا کہ غصہ گورنر سعید پہ کروں یا ناحق شکایت کرنے والوں پہ۔ بہر حال اُنھوں نے دوسرے اعتراض کی طرف رجوع کر کے کہا کہ رات کو ہماری پُکار کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ سعید اگر یہ جواب دیتا کہ رات کو تو میں سو جاتا ہُوں کیونکہ صحت اچھی ہے اور برج کھیلنے کی عادت نہیں تو بے جا نہ ہوتا۔ مگر اُس نے کہا کہ یہ بتاتے ہُوئے مجھے شرم آتی ہے کہ میں نے رات ساری کی ساری اپنے رب کے لیئے مخصوص کر رکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اُن لوگوں سے پوچھا اب کیا کہتے ہو۔ اُنھوں نے کہا چلو یہ بھی نہ سہی۔ مگر مہینے میں ایک دن چھٹی کیوں لیتا ہے۔ جواب ملا کہ اُس دن میں اپنے کپڑے دھوتا ہُوں اور شام تک گھر بیٹھتا ہوں تاکہ کپڑے خشک ہو جائیں۔

راوی لکھتا ہے ویکھو جی! سعید ایک گورنر تھا یا کم از کم ایک کمشنر تو بہر صورت تھا مگر پھر بھی نوکر نہیں رکھتا تھا۔ آٹا خود گوندھتا، کپڑے خود دھوتا۔ آپ بھی سن کر کہہ دیتے ہیں کہ سبحان اللہ! کیا لوگ تھے نہ دن کو سوتے تھے نہ رات کو۔ میں بھی چودھری نذیر احمد خاں کے ڈر سے اتفاق کروں تو اور بات ہے کیونکہ اُنھوں نے جب میری باتوں میں طنز کی تلخی محسوس کی تو فوراً آگاہ کیا کہ کسی دن کوئی فتویٰ صادر ہو جائے گا۔ مگر میں پوچھتا ہُوں کہ آپ انسانوں کی باتیں سُننا چاہتے ہیں یا مافوق البشر کے اُونچے

اُفق پر وُہ چیز ڈھونڈتے ہیں جس کا سایہ آسمان اور زمین کے مقامِ اتّصال پر نظر آتا ہے مگر کیا آپ نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کہیں نہیں ملتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بشر اپنے ساتھ چند ضرورتیں لے کر آتا ہے مثلاً بھوک، پیاس، نیند۔ وُہ ضرورتیں اُس کو خدا نے ہی دی ہیں۔ ان کی تسکین کیئے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اِس لیئے یہ نمونہ عمل کہ ساری رات جاگا کرو عام لوگ کیا خواص کے لیئے بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ صرف خدا کی یہ تعریف ہے کہ نہ اس کو نیند آتی ہے، نہ اُونگھ (لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ) اور خود فرمایا کہ رات اِس لیئے بنائی کہ تم آرام کرو (هُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهَا) مگر یہ سعید بن عامر ہیں جن کو آرام نہیں آتا اور نہ لوگوں کے لیئے آرام کا باعث بن سکتے ہیں۔ جس شخص کے لیئے اللہ نے رسالت رکھی تھی اُس کو بھی ساری رات جاگنے کا حکم نہیں تھا۔ یٰا ایہا المزمل، اُٹھو اور رات کو عبادت کرو، نصف رات یا کم و بیش، کم و بیش اِس لیئے کہا کہ کبھی راتیں لمبی ہوتی ہیں اور نیند کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی اور کبھی چھوٹی ہوتی ہیں اور پھر آگے جا کر فرمایا کہ تمھارا رب جانتا ہے کہ تم اور تمھارے بعض ساتھی عبادت میں کبھی دو تہائی رات، کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات گزارتے ہو مگر علمہ ان لن تحصوہ فَتَابَ عَلَيْكُمْ، اللہ جانتا ہے کہ آپ اتنا نہیں کر سکتے اس لیئے جتنا ہو سکے کریں کیونکہ بعض آپ میں سے بیمار ہیں اور بعض رزق کی تلاش میں پھرتے ہیں اور بعض اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو کیا اِس میں وہ لوگ شامل نہیں جو گورنر کا کام کرتے ہیں۔ یا مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں اور آپ ہی سوچیں کہ اگر ایک گورنر یا کوئی بھی عامل ساری رات جاگتا رہے تو دن کے وقت وُہ خدا کے بندوں کی ضروریات کو کتنی توجہ دے سکے گا۔ تین چار دن میں وُہ صاحبِ فراش ہو جائے گا اور پھر ڈاکٹر لوگ اُسے بستر سے مضبوط باندھ دیں گے اور حکم دیں گے کہ کھانا پینا چھوڑ دو البتہ

پھلوں کا رس پیا کرو۔ سیب کا رس خصوصاً اس موسم میں جب سیب نہیں ملتا۔ دُسہری آم بھی ملے تو کھاؤ مگر آڑو نہ کھاؤ۔ آڑو ایک پشاوری پھل ہے اور پشاور یعنی ہشت نگر کے لوگ دراصل بنی اسرائیل ہیں جو من و سلویٰ چھوڑ کر آڑو کھانے لگے تھے۔ آڑو کے علاوہ دال بھی بُری چیز ہے (یہ میں ڈاکٹروں سے روایت کر رہا ہوں) آڑو اور دال دونوں سے پیٹ بھی خراب ہوتا ہے۔ غالباً افکار کے پریشان ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔ دال کی بجائے کوئی کم قیمت جنس از قسم مُرغ یا مُرغا کھایا کرو اور ناغہ کبھی نہ کرو۔ ناغہ بنی اسرائیل نے کیا تھا اور ناغے کے دن ہی مچھلیاں جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ تعجب ہے کہ شاعروں کا ذکر تو قرآن مجید میں آیا ہے مگر ڈاکٹروں کا نہیں آیا۔ میں اس بات پر ریسرچ کر رہا ہُوں اور پھر آٹا خود گوندھنا اور کپڑے خود دھونا (گودڑ سعید کا ذکر کر رہا ہوں) یہ تو جیسے کوئی بہانہ کرتا ہو یا بیوی کو کام کرنے سے روکتا ہو تاکہ اُس کے ہاتھ سخت نہ ہو جائیں حالانکہ آٹا گوندھنے سے ہاتھ نرم بھی ہو جاتے ہیں اور سفید بھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ رومال اور بنیان کی حد تک تو کبھی کبھی میں بھی کپڑے دھو لیتا ہوں لیکن میں نے اگر اتوار کے دن باقاعدہ کپڑے دھونے شروع کیئے تو پھر جو مجھ سے ملنے آئے گا اُس کو بھی ایک آدھ کپڑا دھونا پڑے گا۔ ساتھ ساتھ اپنی بات بھی کرتا جائے گا۔ اگر اُس کی بات ناقابلِ پذیرائی ہوگی تو کپڑے واپس لے کر کہہ دوں گا بھئی تم بٹن توڑ رہے ہو، اتنے بٹن تو کسی مسلمان دھوبی نے بھی نہیں توڑے تھے۔

اب اُسوہ حسنہ کی طرف پھر رجُوع کرتا ہوُں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ معاشرت سیاست اور فکر کی دُنیا سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب وُہ تھا جو حضور رسالت مآب نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا تھا اور اس کا حقیقی ذریعہ حضور کا بلند ترین کردار اور مُقدس ترین سیرت تھی۔ ایک مغربی مصنّف نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے کبھی یہ دعوٰی نہیں کیا کہ

انھیں غیر معمولی قوتیں حاصل ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔ جو گہرا اثر انھوں نے اپنی قوم پر ڈالا اپنے اعلیٰ کردار سے ڈالا۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیسا رسولؐ ہے جو خود بازار سے سودا لاتا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ جب کوئی فرشتہ اُن کے پاس آتا ہے تو کیوں اُسے سبزی خریدنے کے لئے نہیں بھیج دیتے اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کے بازار میں جاکر سبزی یا کپڑا خریدنے کو آپ کے تخیل پر محمول کرتے ہیں۔ یہاں ایبٹ آباد میں میرے گھر سے ملحق ایک سڑک گزرتی ہے جس پر آنے جانے والے مجھے مالی کا کام کرتے دیکھتے ہیں۔ ایک شخص نے ایک دفعہ ہمدردی سے پوچھا آپ کے پاس مالی نہیں ہے؟ میں نے کہا ہے تو۔ مگر میں خود بھی کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ آپ خود کیوں کام کرتے ہیں؟ آپ کے ہاتھ سخت ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ ہاتھ سخت ہو جائیں تو دل نرم ہو جاتا ہے اور پھر کیا معلوم کہ آگے جاکر دُنیا کی کیا حالت ہو۔ زمانے نے کوئی انقلابی کروٹ لی تو میں اپنے ہاتھوں کے چھالے دکھا کر یہ کہہ سکوں گا کہ میرے تو ہاتھ بھی مزدوروں کے سے ہیں اور دل بھی مزدوروں کا ہے کیونکہ میں بھی کبھی کبھی کام سے جی چُراتا ہوں ویسے یہ چھالے جو ہاتھوں پر نظر آتے ہیں دل پر ہونے چاہئیں مگر دل پر چھالوں کا اتنا ہجوم ہے کہ وہاں جگہ نہیں رہی۔ وہ آبلہ پروری کے اِس فلسفے کو نہ سمجھ سکا۔ جب دو تین ہفتے مجھے اِسی طرح کام کرتے دیکھتا رہا تو اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ جاتے جاتے یہ سُنا گیا "جناب! مالی رکھو۔ مالی ۔۔۔!"

جب کسی دیہاتی اور مزدور میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا اچھا نہیں تو اُس کام پر اُس کو فخر کیا خاک ہوگا۔ یہ باتیں ہیں جو آپ عید میلاد یا سیرت النبیؐ کے علاوہ بھی، جہاں بیٹھیں، لوگوں سے کہہ سکتے ہیں تاکہ اُن میں وہ ذہنی انقلاب پیدا ہو!

ہو جو کسی اور نے اپنے کردار سے پیدا کیا تھا یہ کہنا کافی نہیں کہ وُہ جو کی روٹی کھاتے تھے اور عقیقے میں بھی اُن کے ہاں گوشت نہیں ہوتا تھا اور پکی اینٹ تو کیا کچی اینٹ کا مکان بھی نہیں بنایا اور مکان کی چھت اِتنی پست تھی کہ اُس کو ہاتھ لگ سکتا تھا۔ جو چیزیں قرآن مجید نے جائز کی ہیں اُنھیں اُن مثالوں سے کیوں غیر مستحب کرتے ہو قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ دنیا کی اچھی چیزوں کے لیئے بھی دُعا کرو اور آخرت کی بھی اچھی چیزیں مانگو (رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً) یہ البتہ آپ بلند آواز سے کہیں کہ وہ دُنیا میں رہ کر، تجارت کرتے ہوئے، بازاروں میں جاتے ہوئے، دنیا والوں کا کیرکٹر اپنی مثال سے بناتے رہے ہے۔ ایک مثال امانت اور دیانت کی تھی جس کی وجہ سے وُہ امین کہلاتے۔ ایک اُن کے پاس ذہنی امانت تھی جو آپ کے پاس بھی ہے اور آج میں اُس امانت پر زیادہ زور دینا چاہتا ہُوں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہی امانت تھی جس کو آسمان و زمین نہیں اُٹھا سکے تھے۔ وحملھا الانسان مگر انسان نے اپنے ذمہ لے لی۔ اور یہ امانت عقل کی تھی جو سچ بولنے کی تلقین کرتی ہے اور ذہنی خیانت سے منع کرتی ہے۔ بس آپ یہ چھوٹی سی بات اپنے ذمے لے لیں تو مَیں وعدہ کرتا ہُوں کہ آپ ایک بڑی قوم بن جائیں گے۔ مگر کسی دن آپ اس بات پر میرا مُواخذہ نہ کر بیٹھیں، مَیں کوئی ولی تو ہُوں نہیں کہ اُس بڑے دربار میں میری رسائی ہو جہاں بڑی قومیں بنائی جاتی ہیں اور یہی ہماری غلطی ہے۔ جب کوئی کٹھن منزل آتی ہے تو ہم کہتے ہیں میں ولی یا پیغمبر تو ہُوں نہیں، یہ بھُول جاتے ہیں کہ ولی اور پیغمبر اولوالعزمی سے بنتے تھے۔ اولوالعزم کا لفظ بھی قرآن مجید میں آیا ہے مگر کیا صرف پیغمبر ہی صاحبانِ عزم ہو سکتے ہیں اور آپ کے لیئے بس یہی رہ گیا ہے کہ پیروں کے کاکلِ معرفت پکڑ کر اور کبھی کھینچ کر بھی، آزمائشوں کے سیلاب عبُور کر لیں اور اپنے پاؤں پانی سے تر نہ ہونے دیں۔ مگر اِس وعدے سے جو میں آپ

سے کہ رہا ہوں کہ آپ اگر ذہنی امانتوں میں راست باز ہو جائیں تو ایک بڑی قوم بن جائیں گے۔ مجھے اُس مُلا کا وعدہ یاد آیا جو اس نے کسی بے نمازی سے کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر چالیس دن متواتر نماز پڑھو تو انعام دوں گا۔ جب چالیس دن نماز پڑھنے کے بعد وہ انعام کے لینے آیا تو مُلا نے کہا اے اُلّو کی دُم اور گدھے کے سُم! میں نے تو تمہارے فائدے کی بات کی تھی میرا مطلب یہ تھا کہ چالیس دن نماز پڑھ لی تو ایسی عادت پڑ جائے گی کہ پھر نہیں چھوڑو گے۔ نماز کی عادت خود تمہارا بہترین انعام ہے۔ بے نماز نمازی نے کہا تو گویا آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا اور اب وعدہ خلافی بھی کر رہے ہیں۔ چلو نہ سہی ــــ میں نے بھی نمازیں بغیر وضو کے ہی پڑھی تھیں۔

دُنیاوی اعمال بھی اُس وقت تک پھل نہیں لاتے جب تک صاحب عمل باوضو نہ ہو۔ وضو سے محض جسم کی پاکیزگی مراد نہیں بلکہ اس کا مقصد کسی کام کرنے کی تیاری اور ارادہ ہے۔ وہ ارادہ بذاتِ خود تزکیۂ نفس کا موجب بنتا ہے۔ اُس ارادے کی پختگی کا کیا کہنا کہ ذرا بھی مخالف ہَوا چلی اور ارادہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُس کو وضو کا ٹوٹنا کہتے ہیں۔ میری زبان میں ہر اتنے مخالف وُہ خارجی عفونت ہے جس سے ارادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یعنی جس ارادے سے آپ نے ایک اچھا کام شروع کیا تھا وہ دیگر رجحانوں کے آنے سے ناپاک ہو جاتا ہے اس نفسیاتی مشکل کو مثال سے کر ذرا آسان نہ کر دُوں۔

پچھلے ہفتے میں لاہور میں تھا۔ شام کے وقت میں باغ میں کام کر رہا تھا کہ سڑک پر کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے اپنے جمعدار سے پوچھا کیا بات ہے؟ اُس نے کہا کہ ایک لڑکے کے پیٹ میں سخت درد ہوا تھا جس سے وُہ بیہوش ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اُس کو گھر پہنچانا چاہیئے۔ اُس نے کہا گھر کا پتہ نہیں معلوم۔

لوگ گزرتے ہوئے ذرا ٹھہر جاتے ہیں پھر اُس کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا چلو ہسپتال ہی پہنچا دیں۔ مگر جوں جوں میں سڑک کے قریب ہوتا گیا میرے دل میں یہ وہم بڑھتا گیا کہ اگر اِس لڑکے کو ہیضہ ہوا تو مجھے بھی بیماری لگنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ میرا ارادہ کمزور ہو رہا تھا۔ اُس میں خارجی عفونت پیدا ہو رہی تھی۔ اس کشمکش و پیچ کی حالت میں میں موقعہ پر پہنچا وہاں دیکھا کہ ایک موٹر پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور لڑکے کو موٹر میں لٹا دیا گیا تھا۔ ایسے وقت کوئی پہنچے تو فرشتۂ رحمت کہلاتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ اب میری موٹر کی ضرورت نہیں رہی تو میں بھی موٹر پیش کرنے پر تیار ہو گیا۔ زیادہ نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فرشتۂ رحمت جسٹس شبیر احمد ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ ایک آدمی مل گیا ہے جو بیمار کا گھر جانتا ہے۔ جسٹس شبیر احمد نے اُن باتوں کا خیال نہیں کیا جو میرے ارادے کو کمزور کر رہی تھیں۔ میں نے دل میں کہا آپ مجھ سے بہت اونچے ہیں۔ خدا آپ کو جسٹس شبیر احمد خاں کر دے۔ ایک پٹھان کسی کو اِس سے زیادہ اور کیا دُعا دے سکتا ہے۔ وہ خان کے بغیر انسان کی شخصیت کو نامکمل سمجھتا ہے اور شخصیت کو مزید سنوارنا مقصود ہو تو ایک خان نام کے شروع میں بھی لگا دیتا ہے مثلاً جسٹس خان شبیر احمد خاں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری دُعا جلد قبول ہو جائے گی۔ خیر چھوڑیے اس قصے کو۔ جو بات میں واضح کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ میرا عمل بے وضو تھا۔ یعنی میرے ارادے کی کمزوری اس کی تکمیل میں حائل تھی۔ شبیر جیسے لوگ ہمیشہ باوضو رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک چھوٹی سی بات پر ہماری لڑائی ہو گئی۔ وہ کہتے تھے کہ ایڈووکیٹ جنرل بڑا ہوتا ہے۔ میں کہتا تھا کہ لیگل ریمیمبرنیسر LEGAL REMEMBRANCE بڑا ہوتا ہے۔ معاملہ وزیرِ اعلیٰ تک پہنچا۔ اُنھوں نے دونوں کو بُلایا۔ غالباً یہ بتانے کے لیے کہ تم دونوں سے بڑا میں ہوں۔ مگر شبیر نے اُن کو یہ موقعہ نصیب نہیں

ہونے دیا پیشی سے دس منٹ پہلے اُس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ لیا اور کہا کہ میں یہ جھگڑا یہیں ختم کر دوں گا۔ آپ نے اُن کی تصویر دیکھی ہو تو یاد ہو گا کہ جج جیفرے کی طرح چوڑا اور بارعب چہرہ ہے۔ اندھیرے میں شاید ہیبت ناک بھی ہو کُرسی ان کے جسم سے خُوب بھر جاتی ہے۔ مَیں نے اپنے کندھوں سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ آپ میرے کندھے بھی مُلاحظہ کریں۔ کندھوں نے ملکہ بلقیس کی زبان میں کہا "اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا"۔ جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اُسے پائمال کر دیتے ہیں۔ جب کسی کو کندھوں سے پکڑتے ہیں تو اُن کو برابر کر دیتے ہیں۔ مَیں چیف منسٹر کے کمرے کی طرف حسرت سے دیکھنے لگا۔ شبّیر نے کہا "نہیں۔ وُہ کمرہ ابھی وُور ہے۔ مَیں یہیں پر جھگڑا ختم کیئے دیتا ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے اور فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ بڑے ہیں۔" میں نے یہ سُنا تو خوشی سے میری باچھیں کھُلی ہوں یا نہ کندھے ضرور کھُل گئے۔ مَیں نے خوشی اور فیاضی سے کہا "نہیں۔ آپ بڑے ہیں۔" اُس نے کہا "نہیں آپ بڑے ہیں۔" میں نے کہا "پہلے آپ"۔ اِس پر ایک اور جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ اور آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ ہم دونوں بڑے ہیں چونکہ آفتاب چندے مہتاب۔ مَیں نے مہتاب بننا پسند کیا۔ کیونکہ سُورج تو اُس وقت چمکتا ہے جب دن کی روشنی دنیا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور چاند اندھیرے میں چمکتا ہے۔

القصّہ نہ وُہ ایڈووکیٹ جنرل رہے نہ میں لیگل ری میم برنیسر ؎

نہ وُہ حسُن میں رہیں شوخیاں

نہ وُہ عشق میں رہیں گرمیاں

اقبالؔ کے عشق نے ہم دونوں کے بَل نکال دیئے اور ایک حُبِّ علی میں مبتلا ہُوا تو دوسرا بُغضِ معاویہ میں۔ یہ پتہ نہیں کہ کون کس میں مگر خُدا جانے وُہ بڑائی جس کے لیئے ہم لڑ رہے تھے آجکل کہاں ہے۔ ہم یقیناً ساتھ تو نہیں لائے، نہ ساتھ لے جائیں گے۔

تو میرے دوستو! اگرچہ آج مَیں چودھری نذیر احمد خاں کی عدم موجودگی میں عید میلاد منا رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ یہ باتیں سن کر اُن کی رُوح خوش ہو گی وہ جہاں بھی ہوں خدا کرے اچھی سوسائٹی میں ہوں۔ مگر اس بات کا انتظار کریں کہ مجھ پہ کوئی فتوٰی صادر ہو۔ مگر مجھے فتوٰی سے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ پھر کوئی اُن سے یہ نہ کہہ دے کہ دیکھتے صاحب! کیا نیات صاحب کو اور جو کچھ کہنا تھا کہہ دیتے وہ تو نیشِ عقرب کی طرح عادت سے مجبور ہیں اور نیشِ عقرب کا پاکستانی نام اب کیفیات ہے۔ مگر آپ کی مقدس رُوح کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ دو سال پہلے وہ یہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مَیں نے اُن کے بارے میں مرحوم کا لفظ استعمال کیا تھا کیونکہ اُن دنوں وُہ تازہ تازہ اٹارنی جنرل ہوئے تھے آپ بھی سُن کر خوش ہوئے تھے اور مَیں تو خوشی سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہوں۔ ایک ماہ بعد لاہور میں اُنھوں نے قصہ سُنایا کہ ایک شخص نے اُن سے پُوچھا کہ کیا انھیں معلوم ہے کہ مَیں نے اُن کا ذکر کرتے ہُوئے انھیں چودھری نذیر احمد خاں مرحوم کہا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا " ہاں مجھے معلوم ہے مَیں خُود بھی وہاں موجود تھا۔ مَیں خود وُہ باتیں سُن کر بہت خوش ہُوا تھا۔ " اللہ آپ پر بھی رحم کرے۔ " اعتراض کنندہ نے بات بناتے ہُوئے کہا " شاید آپ نے اُن کی تقریر غور سے نہ سُنی ہو۔ "

تو اے وہ لوگو جو ایمان نہیں لاتے! غور سے سُنو کیونکہ مَیں نے یہ تقریر لکھتے وقت محنت سے کام لیا ہے۔ محنت اس طرح سے کہ جب میرے پریشان افکار بکھرتے ہیں تو دُور دُور تک پھیل جاتے ہیں۔ مجھے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اُن کے رستے میں کسی وادیٔ نمل سے گزرتے ہُوئے کتنی چیونٹیاں پریشان ہو گئی ہوں گی۔ یہ کہنا تو شاید بجا نہ ہو کہ "یایھا النمل ادخلوا مساکنکم" اے وادیٔ نمل کے رہنے والو داخل ہو جاؤ اپنے گھروں میں کیونکہ " افکارِ پریشان " کے سلیمان شکوہ جلوس چیونٹیوں کو روندتے

چلے آرہے ہیں۔ دراصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں ایک پریشان خیال کو بڑی مُشکل سے گرفتار کرکے لفظوں کا جامہ پہناتا ہوں، پھر کاٹ دیتا ہوں اس لیے کہ یہ کپڑے دھونے کے متعلق ہے اور کوئی دھوبن ناراض ہو جاتے گی۔ پھر کچھ اور لکھ کر کاٹ دیتا ہوں کیونکہ یہ حجامت کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ کسی گنجے یا نائی کی ناراضی کا باعث بن جائے۔ ایک صاحب نے دو صفحے تعریف کے لکھ کر میری توجہ خاص طور پر اس طرف مبذول کرائی کہ شہری تو سمجھ دار ہوتے ہیں مگر دیہات پہنچ کر میری باتیں کچھ کا کچھ بن جاتی ہیں اور اس طرح بیکار غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ پہلے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں ان پریشانیوں میں وقتاً فوقتاً مبتلا ہوتا رہا ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر کچھ کہنا ہی ہے تو اس طریقے سے کہوں جس طرح اور لوگ کہا کرتے ہیں یعنی سبحان اللہ! کیا لوگ تھے۔ رات کو نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ دن کو آٹا گوندھتے تھے اور کپڑے بھی خود دھوتے تھے اور بیوی اتنی اچھی تھی کہ وہ خلیفۂ وقت کے پاس کبھی شکایت لے کر بھی نہیں گئی کہ یا مجھے طلاق دلواؤ یا حقوقِ زن و شوئی۔ غالباً میرے نامہ نگار کی یہ باتیں سُن کر حسبِ سجاد نے ایک مرثیہ یہ بھی تجویز کیا ہے "کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی"۔

پہلی بات کا تو میں کیا جواب دوں۔ مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہُوئے کہ میری ذہنی ضرورتوں کو بعض لوگ اپنی ذہانت کے پیمانے سے کیوں ناپتے ہیں۔ دُوسری بات جو انھوں نے طرزِ اظہار کے بارے میں کہی ہے اُس کی تعمیل میں میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اِس مضمون کا اصل مسودہ تصحیح اور ترمیم کے نشتر سے زخمی پڑا ہے۔ چودہ زخم شدید ہیں اور ایک سو چودہ خفیف۔ اِس میں نو آیات ہیں اور باقی روایات۔ اِس کے لکھنے میں دس دن لگے ہیں۔ اور افکار ویسے کے ویسے ہی پریشان ہیں ابھی تو میں نے وہ مرثیہ پڑھا ہی نہیں جس میں قوم

کے نام خطاب ہے مگر سجاد صاحب کے اِس مرثیے پر مجھے انتخابات کے زمانے کا ایک قصہ یاد آگیا۔ ووٹ ایک امیدوار کے ساتھ زیادہ تھے مگر سرکار دُوسرے اُمیدوار کے ساتھ زیادہ تھی اور اُس کے حق میں کھُلم کھُلا فرضی ووٹ ڈلے جا رہے تھے۔ انتخاب کی نگرانی ایک تحصیلدار کر رہا تھا۔ آزردہ اُمیدوار نے اِس دھاندلی پر تحصیلدار سے شکایت کی۔ تحصیلدار نے کہا کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس شکایت کرو۔ اُمیدوار نے کہا شکایت کی ہے مگر کچھ نہیں ہوا۔ تحصیلدار نے کہا چیف منسٹر کے پاس شکایت کرو۔ امیدوار نے جواب دیا وہاں بھی شکایت کر چکا ہوں مگر کچھ نہیں بنا۔ تحصیلدار نے کہا تو کیا اتنے لوگوں میں ایک میں ہی آپ کو دیانت دار نظر آتا ہوں؟ میں نے آخر کیا قصور کیا ہے؟

اور میں نے کیا قصور کیا ہے؟

عاشقی قیدِ شریعت میں جو آ جاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

تعلیم الاسلام کالج

ربوہ

صاحبِ صدر!

آپ نے میرے مسلسل انکار کے باوجود جس زبردستی سے مجھ سے یہاں آنے کا وعدہ لیا تھا اُس کے پیشِ نظر میں شکریے سے تو عاجز ہوں اور یوں بھی ایسے موقعوں پر شکریہ ادا کرنا ایک رسمی بدرسمی ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان برخورداروں کو جو قومی زندگی کی دہلیز پر ہیں کون سی کام کی بات سُنا سکتا ہوں۔ علی بابا اور چالیس چور کی کہانی یا داستانِ امیر حمزہ۔ یہ قصّے تو پہلے ہی سُن چکے ہوں گے۔ یہ کہنا بھی بیکار ہے کہ آپ قوم کا بیش بہا سرمایہ ہیں کیونکہ یہ بات تو وہ پُشت در پُشت سنتے چلے آئے ہیں۔ یہ بھی سُنا ہو گا کہ آپ کو قومی زندگی کی بڑی بڑی ذمہ داریاں اُٹھانی پڑیں گی۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے کسی بزرگ نے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ محنت کرو انعام لو۔ محنت کرو اکرام لو۔ ہم تو اٹھارہ گھنٹے کام کرتے ہیں آپ آٹھ گھنٹے ہی کریں۔ کیونکہ آپ ہم سے کچھ زیادہ جوان ہیں۔

اِن سب باتوں کے بعد اتنا ہی کہنا رہ گیا ہے کہ قوم کا بیش بہا سرمایہ ہونے کے باوجود آپ سب کے سب گورنر یا وزیر یا جج نہیں بن سکیں گے (ججوں کو کسرِ نفسی سے شامل کرتا ہوں) ہر چند کہ تقسیمِ ہند کے بعد اِن عہدوں کے لیئے جلد جلد باری

آتی رہی ہے۔ پھر بھی آپ میں سے بہت سے معمولی عہدوں کے حامل ہوں گے اور اِس لیئے یہ کہنا ضروری ہے کہ ع

گر بہ نکبت بری لپست نہ گردی مردی

یعنی غربی آئے اور پھر بھی طبیعت میں پستی نہ پیدا ہو تب تو صاحب کردار کہلانے کا مستحق ہے یا اگر خدا زندگی میں دولت و ثروت عطا کرے بھی اور تو مست نہ ہو تب تو صحیح معنوں میں مرد ہے۔ ع گر بہ دولت بری مست نگردی مردی

آپ سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ محنت کرو، محنت کرو، ممکن ہے یہ سن کر آپ پر اِس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہو اِس لیئے میں نعم البدل کے طور پر یہ کہوں گا کہ کچھ کھیلا بھی کرو تا کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکو اور شاید کھیلتے کھیلتے یہ احساس پیدا ہو کر دنیا تو کھیل کود ہے ذرا کام بھی کریں کیونکہ والد بزرگوار نے اگر کوئی جائداد چھوڑی بھی تو اُن کے آٹھ دس بچّے اور بھی ہیں۔ اِس سوال سے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ اُن کو کیوں اپنے گھر میں ایک فٹ بال ٹیم کی ضرورت پڑی اور کس لیئے اِس ٹیم میں ہر تین سال گزرنے کے بعد دو مزید کھلاڑیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ تمہاری والدہ کی صحت ؟ بیاعورتوں کی صحت اِسی طرح اچھی رہتی ہے اور جب چار پانچ بچوں کے بعد اُن کی جوانی بڑھاپے کی نذر ہو جاتی ہے اور والد بزرگوار خود بلا شرکت غیرے جوان رہتے ہیں تو مجبوراً اور شادی کرنی پڑتی ہے تاکہ خُدا اولاد و رحبوں میں اضافہ ہو۔

مگر اب تو ابّا جان کو پکڑنے سے کچھ فائدہ نہیں اِس لیئے آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ ویسے بھی اپنے پاؤں اپنے پاؤں ہیں اور ابھی تمہارے بھائی کچھ ایسے ہوں گے جو نابالغ ہیں اور اپنے پاؤں پر نہیں کھڑے ہو سکتے اور تمہارا آخری بھائی جب پیدا ہوا تو ابا جان ساڑھے اکیاون سال کے تھے۔ اُس وقت تو حفیظ جالندھری کے ساتھ "ابھی تو میں جوان ہوں" پڑھتے ہوں گے یہ خیال بھی نہیں

ہوگا کہ ساڑھے تین سال کے بعد سرکار انھیں بوڑھا قرار دے دے گی اور یہ بچہ گیا، اِس دور جن میں سے چار پانچ اور ابھی نابالغ ہوں گے۔ اِس لیئے ہیں نے دیکھا ہے کہ پہلے دو تین بچوں کو تو اچھی طرح تعلیم دیتے ہیں مگر بعد میں مالی استعداد کے کم ہونے پر قرآن شریف کی اُن آیات کا سہارا لیتے ہیں جو اللہ کے رزاق ہونے کے متعلق ہیں یہ بھولتے ہیں کہ اللہ نے دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور آپ کو بار بار کہا ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں اور بارش کے زمین پر پڑنے میں اور اُس کی وجہ سے سبزے کی روئیدگی میں نشانیاں پیدا کی ہیں، ان پر غور کرو۔ نشانیاں تو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں۔ مگر اور طرح سے یعنی یہ بچہ نپولین بنے گا یا نہیں۔ اور اگر نہیں بنے گا تو ممکن ہے اگلا ہی نپولین ہو۔ اِس لیے جب تک نپولین نہ آئے رود نیل بہتا چلا جائے گا۔ مگر نہیں سوچتے کہ نپولین رود نیل پر ہی پہنچ کر ختم ہو گیا تھا اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ نپولین آپ ہی کے گھر میں پیدا ہو؟

اِتنا لکھ کر مجھے مرزا البشیر احمد کے خوبصورت مضمون خاندانی منصوبہ بندی کا خیال آیا۔ انھوں نے یہ مضمون بڑی کاوش سے لکھا ہے اور کم از کم مجھے اس کے پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ برتھ کنٹرول کے متعلق میری معلومات پہلی صدی ہجری تک پہنچ گئی ہیں۔ صاحبان ایمان متناز عہ امر میں نہیں پڑتا، البتہ بعض محتاط لوگوں کی طرح کہا کرتا ہوں "آپ سچ فرماتے ہیں مگر. . . . ." اور کبھی کبھی اس مگر سے ایک پورا لمکچر نکل آتا ہے۔ اس مقام پر یہ مگر مجھے مرزا البشیر احمد کی اپنی ہی تصنیف میں انگڑائیاں لے رہا ہے یعنی حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا۔ گویا بچے کے حمل میں رہنے اور دودھ پینے کا زمانہ قدرتی طور پر تیس مہینے ہونا چاہیئے۔ اب آپ نو مہینے اور دس دن کا حصّہ تو بدل نہیں سکتے۔ دوسرا حصّہ ایک سال آٹھ مہینے رہ گیا۔ یہ تو جیسے کم پلسری COMPULSORY یعنی لازمی ہو تو اس پر حد کیوں قائم کی

جائے یعنی یہ کہنا عجیب ہوگا کہ ایک سال آٹھ مہینے کنٹرول جائز اُس کے بعد ناجائز۔
یہ مسئلہ مَیں نے ضمناً نہیں چھیڑا اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اُن مسائل میں سے
ہے جن سے کالج کے طلباء کو جلد دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ جس طرح ہماری زندگی کے بعد
ایک بڑی چیز آنے والی ہے جسے آخرت کہتے ہیں اِسی طرح زندگی کے اندر بھی ہر
چھوٹے معاملے کے لیئے آخرت مقرر ہے۔ مثلاً پڑھائی کے بعد امتحان اور اُس کے
نتائج۔ جلی ہوئی روٹی کھانے سے پیٹ میں درد۔ اگر اُس چھوٹی آخرت کی خبر جو شادی
کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے آپ کو ابھی سے دی جاتے تو آپ کو اُس پر غور کرنے
کا موقعہ مل جاتے گا اور آپ اپنے حالات کے مُطابق اُزدواجی زندگی کی تشکیل کر
سکیں گے ورنہ جب تک آپ کو یہ پتہ چلے کہ کیا ہُوا تو بمصداق ع

چشم وا کردہ جہانِ دگرے پیدا شُد

آنکھ کھولیں گے تو ایک نئی دُنیا آپ کو اپنے گرد کھیلتی نظر آئے گی۔ پھر کوئی خاتون
مسلم لیگ کی طرف سے، کوئی سوشل ویلفیئر کا سہارا لے کر" ٹیلیفون کریں گی کہ فلاں
کی تبدیلی اگر قصور یا نارووال نہ کی جائے تو ممنون ہوں گی۔ جب اُن سے کہا جاتے
کہ عموماً نئے افسروں کو چھوٹی جگہ بھیجا جاتا ہے کیونکہ اُن کے گھر بے چراغ ہوتے
ہیں تو خاتون فرماتی ہیں کہ یہاں تو ایسا چراغ موجود ہے جس سے کئی چراغ روشن
ہو چکے ہیں اور مزید چراغوں کے روشن ہونے کی اُمید ہے، ایسی صورت میں باہر جانا
بہت مشکل ہوگا۔ ایک دفعہ تو مجھے کہنا پڑا کہ ہم نے صرف خاوند کو ملازمت میں لیا ہے۔

بہرحال اِس مسئلہ کو ضمنی سمجھیں یا ضرُوری، مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ اپنے پاؤں
پر کھڑے ہوں اور اُس کے لیے کھیلنا بھی ضروری ہے اور یہ صرف آپ کے ادارے
کی چار پانچ ٹیموں تک محدود نہ ہو بلکہ سب کھیلا کریں۔ یقین جانیئے کہ اگر آپ نے
جسمانی ورزش کو تربیت کا ایک ضروری حصہ نہ سمجھا تو بعد میں پچھتائیں گے۔ یہ جو

صبح صبح لوگ سڑکوں پر بھاگے پھرتے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سکول اور کالج کے زمانے میں مرزا پھویا بنے رہے۔ مرزا پھویا پرانے علی گڑھ کا ایک کردار ہے بلکہ اُس کی یادگار ہے۔ وہ گھر میں بڑے نخرے سے پلا تھا۔ اپنے چاروں طرف اس نے نزاکت کا ماحول قائم کر لیا تھا۔ کالج تک پہنچتے پہنچتے خود اچھا خاصا نُسخہ بن گیا تھا۔ گھر خط لکھتا تھا "کالج میں کوئی ماما نہیں کہ سر میں روغن بادام ملے۔ چارپائی سخت ہے، ہو سکے تو گھر سے اور بھجوا دو۔ کرسی کی سیٹ بھی لکڑی کی ہے حلوہ مغز کنجشک ختم ہو رہا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ اِس کے بغیر الجبرا کس جبر سے پڑھوں گا" القصہ اس کا نام مرزا پھویا مشہور ہو گیا۔ وہ لڑکا بھی ایک قسم کا مرزا پھویا ہے جو ورزش نہیں کرتا اور شام کو نفیس کپڑے پہن کر بال بنا کر نکلتا ہے اور زمین پر زم زم قدم رکھتا ہے تاکہ زمین کو دُکھ نہ ہو۔ یہ اگر دُنیا میں کامیاب بھی ہو جاتے، تو اپنے ہی لیئے کامیاب ہو گا۔ زندگی میں نرم نرم قدم رکھے گا۔ آہستہ بخرام بلکہ مخرام آہستہ قدم رکھو بلکہ قدم ہی نہ رکھو، پالکی میں بیٹھو۔ یہ پالکی میں بیٹھنے والے چیزوں کی باگ ڈور نہیں سنبھال سکتے کیونکہ پالکی کی باگ ڈور نہیں ہوتی۔ اُس کو اور لوگ چلاتے ہیں۔ آپ مرزا پھویا بننے سے گریز کریں۔

ویسے مجھے تعلیم الاسلام کالج کی فضا میں مرزا پھویا بننے کی زیادہ گنجائش نظر نہیں آتی۔ مرزا ناصر احمد نے اپنے 'مختصر تعارف' میں جو کہا کہ "گو، ۴۴ ۱۹ء کے بعد اس کالج کی ابتدا ایک ڈیری فارم کی عمارت سے ہوئی تھی جس کا نچلا حصّہ ایک اصطبل کا سا رنگ رکھتا تھا تاہم اُس وقت کے لُٹے پُٹے طلباء نے سختیاں خندہ پیشانی کے ساتھ سہیں" اِس سے مجھے اطمینان ہوا اور اگرچہ وہ طلباء اب چلے گئے ہیں آپ اُن کی روایات سامنے رکھ کر چلیں۔ آپ اب بھی اُس ڈیری فارم کا تصوّر دل میں رکھیں جو محض اِس لیئے چلایا جاتا ہے کہ دیگر لوگوں کے لیے مُفید چیزیں دُودھ

اور کلکمن کی قسم کی چیزیں تیار کی جائیں۔ آپ اپنی ذات کے علاوہ دیگر لوگوں کے لیے مفید بننے کی کوشش کریں۔ اصطبل کا تصور بھی اچھا ہے۔ لوگ اصطبل کے ذکر سے گو برکا بھی خیال کرسکتے ہیں اور گھوڑوں کا بھی۔ لوگ کہتے ہیں یہ مکان نہیں اصطبل ہے۔ لوگ کسی چیز کا بُرا پہلو زیادہ دیکھتے ہیں۔ آپ اچھا پہلو دیکھا کریں۔ ہر شخص کی فکر اُس کی ہمت کے برابر ہوتی ہے۔ اگر گھوڑا اچھا جانور نہ ہوتا تو زبان میں گھوڑوں سے متعلق محاورے حسنِ کردار کے معنوں میں نہ استعمال ہوتے۔ گو تے و چوگان کا تصور بغیر گھوڑے کے مشکل ہے۔ اسپ تازی کی مثال سے سعدی نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر اچھی نسل کی چیز کمزور بھی ہو تو بُری نسل کی چیز سے اچھی ہوتی ہے سہ

اسپ تازی اگر ضعیف بوُد

ہمچناں از طویلہ خر بہ

اور گدھے کو خود بھی یہ احساس ہے کہ گھوڑا مجھ سے بہتر ہے۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر ایک دن ایک گدھے کی ملاقات ایک فورڈ گاڑی سے ہوئی۔ یہ پُرانی فورڈ کا ذکر ہے جو اُس وقت موٹروں میں ناقص تصور کی جاتی تھی۔ گدھے نے فورڈ سے پوچھا "آپ کون ہیں؟ فورڈ نے کہا "میں موٹر کار ہوں" گدھا ہنس کر بولا "میں گھوڑا ہوں"۔

اسی طرح سبک رفتار کا لفظ اور سمندِ ناز کا مقام تو خاصا اونچا ہے۔ ناز ور شعر کو سمندِ ناز سے تشبیہ دے کر اُسے تازیانہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں ع

سمندِ ناز پہ اِک اور تازیانہ ہوُا

پس اگر صنفِ نازک کے اوصاف کی تشبیہ بھی گھوڑے کے اوصاف سے دی جاتی ہے تو گھوڑا اچھا ہی جانور ہوگا۔ ورنہ شترِ غمزہ اور خرِ دماغ جیسے لفظ بھی تو رائج ہیں۔

یہ سالے شُتر غمزے اصطبل کے کوکرے سے پیدا ہوئے جس اصطبل سے آپ کی ابتدا ہوئی ہے اُس کو نہ بھول جائیے گا۔ مجھے عرب کا ایک پرانا قصہ یاد آیا غالباً خلفائے راشدین کے زمانے کا ذکر ہے کہ عرب کے ایک سفیر کے متعلق جو غیر ملک میں تھا خلیفہ کو شکایت پہنچی کہ شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ لباس حریر پہنتا ہے۔ خلیفہ نے ایک خاص آدمی دریافت کے لیے بھیجا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ابریشم کی قبا اوڑھے ہے۔ ایلچی نے اپنے آنے کا مدّعا بتایا تو سفیر نے ابریشم کی قبا کا ایک گوشہ اٹھا کر دکھایا کہ وہ نیچے گدڑی پہنے ہوئے ہے اور یُوں تشریح کی کہ میری عادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف اِس خیال سے ریشم پہننے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ یہاں کے درباری یہ نہ کہیں کہ عرب والے خرقہ پوش جاہل ہیں۔

ممکن ہے یہ قصہ تمثیلی حیثیت رکھتا ہو۔ بہر حال میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ پتلون کے نیچے بھی ڈھائی گز کی چادر باندھا کریں۔ آپ کا دِل خرقہ پوش ہے تو کافی ہے اور یہ حسنِ قبا پوشی بڑے عہدوں میں زینت بخشتی ہے چھوٹے عہدے تو خود خرقہ پوش ہیں۔

کالج کے زمانے کو آپ ایک مقفل صندوق کی طرح آئندہ زندگی سے علیٰحدہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ جو عادتیں آپ یہاں بنائیں گے وہ مستقبل میں آپ سے علیٰحدہ نہیں ہوں گی۔ یہ برفانی پہاڑوں کی ندی جو آپ کے منبع سے جاری ہے آپ کے ساتھ ریت کے ٹیلوں میں بھی جاری رہے گی۔ یہ غلط ہے کہ اچھا کاروبار مل گیا، تو عادتیں خود بخود اچھی ہو جائیں گی۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کے عیب دولت میں چھپ جائیں گے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے کہا کہ دولت خدا تو نہیں مگر بخدا وہ خدا کی طرح ستار العیوب اور قاضی الحاجات ہے۔ اور زندگی میں بیشتر حصّہ اُن لوگوں کا ہے جو اسی طرح ظاہری خوش خرامی کے ساتھ صبح کرتے ہیں، شام کرتے ہیں اور عمر یُونہی

تمام کرتے ہیں مگر چند ایک ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی پیشانی آپ لوگ پہچان لیتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان پیشانیوں میں آپ کو کیا نظر آتا ہے مگر انھیں دیکھ کر آپ کے دلوں میں ایک تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اُن لوگوں کی تعداد میں آپ اضافہ کریں۔ اُن پیشانیوں کی تعداد میں اللہ تعالیٰ نے جمہوریت کا اصول نہیں رکھا ہے۔ نو دو سو گدھوں کے مغز سے ایک انسان بنتا ہے نو دو ہزار خوش خراموں کے صبح شام کرنے سے ایک اہلِ فکر پیدا ہوتا ہے۔ میں نے غلط کہا کہ اس جگہ جمہوریت کا اصول نہیں رکھا میرا مطلب مساوات کے اصول سے تھا جمہوریت تو اس طرح پر ہوتی کہ دو ہزار خوش خرام جب ایک آدمی کو پیشانی سے پہچان لیں گے تو اُس کی متابعت کریں گے اسی کو ووٹ دیں گے۔ جب میں کہتا ہوں کہ اُن کی تعداد میں آپ اضافہ کریں تو میرا اصلی مدعا یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کی نشوونما اُس فضا سے ہوتی ہے جس میں وہ پلتے ہیں۔ اس کو آجکل اُردو میں ماحول کہتے ہیں جو غلطی سے بعض دفعہ لاحول کر دیتا تھا۔ مجھے ماحول کا لفظ یاد نہیں ہوتا تھا مگر لاحول سے کچھ صوتی اور کچھ معنوی مناسبت نے یہ مشکل آسان کر دی کیونکہ بعض ماحول ایسے ہوگئے ہیں جن کو دیکھ کر لاحول پڑھنا پڑتا ہے جیسے طالب علموں کے لیئے مرزا ناصر احمد کے الفاظ میں "لاہور کا مسموم فضا" جس کا ذکر ابھی انھوں نے اپنے مختصر تعارف میں کیا ہے اور جس کی وجہ سے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کالج کو لاہور سے یہاں منتقل کیا جائے اب جیسی فضا انھوں نے اور اُن کے سٹاف نے یہاں بنائی ہے اُس کا انحصار اُن کی دُور بینی اور دانش مندی پر ہے کیونکہ لڑکے تو گیلی مٹی کی طرح ہیں جیسے سانچے میں اُن کو ڈھال دیا جائے ویسی شکل اختیار کرلیں گے۔ مگر میں نے ایک اینٹ بنانے والے سے جس کی اینٹیں بدصورت ہوتی تھیں اور زیادہ ٹوٹتی تھیں سنا کہ یہ مٹی کا قصور ہے اس میں وہ چکناہٹ نہیں جس سے قوام پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا اس میں

وُہ چیز ڈالو ناجس سے چکناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُس نے کہا وُہ نزدیک سے دستیاب نہیں ہوتی اور خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ مَیں مرزا ناصر احمد سے اُمید رکھتا ہوں کہ اگر بعض طالب علموں کی مٹی میں واجبی چکناہٹ نہ پائیں تو اُس کی کمی محنت اور تربیت سے پوری کر لیں گے اور اپنے سٹاف کی بھی اِس طرح تربیت کریں گے کہ وہ میرے اُس پرانے اُستاد کی یاد نہ تازہ کریں جو کلاس میں اپنی مقدس ٹانگیں میز پر رکھ لیتا تھا اور جن ٹانگوں کو ہیڈ ماسٹر کبھی خاموشی سے اندر آ کر میز سے اُٹھا کر نیچے رکھ دیتا تھا اور جب تک وہ اپنی ٹانگوں کی گنتی کرے کہ ٹھیک تعداد میں اُتری ہیں یا نہیں ہیڈ ماسٹر اُسی خاموشی کے ساتھ دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا تھا۔ اُستاد جی اب ٹانگ پر ٹانگ جمائے شاگردوں سے کہتے "پڑھو۔ ہمیں تو روزی حلال کرنی ہے۔ اور یہ ٹانگوں کو میز کے نیچے دھرنا کون سی ہیڈ ماسٹری ہے۔" ہمارے ملک کے شمال مغربی اطراف میں کسی چیز کو ذبح کرنا ہو تو کہتے ہیں اس کو حلال کرو۔ آپ سے استدعا ہے کہ اُستاد جی کی طرح روزی حلال کر کے تعلیم و تربیت کو ذبح نہ کریں۔ بلکہ اس فضا کو فراخ کر دیں تاکہ لڑکوں کے سینے کھُل جائیں۔ اس طرح کی درس گاہوں پر بعض دفعہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ بے اعتنائی سکھاتی ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ؏

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

میرا مشورہ یہ ہے کہ اِس اعتراض کو پیشِ نظر رکھ کر آپ اپنا پہلا اصُولِ تعلیم یہ بنائیں کہ آپ کے طالب علموں میں احساسِ بیگانگی پیدا نہ ہو۔ جب وُہ اِس محدُود جگہ کو چھوڑ کر زندگی میں قدم رکھیں تو لوگوں کو محسوس ہو کہ یہ کسی خاص تربیت گاہ سے آئے ہیں۔ یہ جفاکش بھی ہیں، ایثار کا مادہ رکھتے ہیں، اور اِن دونوں باتوں سے بڑھ کر، یہ کہ تنگ دل نہیں ہیں۔ ؎

چیں بر جبیں ز جنبشِ ہر خس نمی زنند　　　دریا دلاں ز آب گہر آرمیدہ اند

ان کے دل دریا جیسے ہوں جس میں موتی کا پانی بہتا ہو اور ہر تنکے کے گرنے سے اُن کی پیشانی پر بَل نہ پڑیں۔ ایسے لوگ صرف تعلیم الاسلام کالج کے نہیں بلکہ پاکستان کے ہیں۔ صرف پاکستان کے نہیں بلکہ دنیا کے ہیں اور اس سینے میں یہ دیکھ کر زیادہ خوش ہُوا ہُوں کہ اس کالج میں قریباً ۵۰ فیصد طلباء اُس گروہ کے نہیں ہیں جس کا ربوہ سے خاص تعلق ہے۔ میں اس گروہ کا جذبۂ ایثار دیکھ کر تعریف کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کے گزشتہ نتائج یونیورسٹی کی اوسط سے بہتر ہیں۔ مگر میں محض سالانہ نتائج پر نہیں جاتا۔ میں دس بیس سال کا نتیجہ دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ سُنا ہے کہ آپ کا کالج کشتی رانی میں کئی سال سے یونیورسٹی میں اول آرہا ہے۔ یہ کشتی رانی جاری رکھیئے گا۔ ہماری کشتی کبھی بھنور کے قریب جانے لگتی ہے، کبھی اِس میں سُوراخ ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں تو اِس کے چپّو مرمت کے محتاج رہتے ہیں۔ جب آپ کی باری آئے تو اِس طرح چلائیں جس طرح مشّاق کشتی ران چلایا کرتے ہیں ٭

حدِّ ادب

اَے اصحابِ کہف

یومِ پاکستان

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء

لاہور

حضرات!

آج میرا خطاب بالخصوص نوجوانانِ پاکستان اور خواتینِ پاکستان سے ہے اور اگرچہ ان الفاظ میں ہلالِ پاکستان اور ستارۂ پاکستان کی سرکاری زینت نہیں، اگر کوئی اِس ملک میں نوجوانِ پاکستان اور خاتونِ پاکستان کہلانے کے قابل ہو تو اس سے زیادہ زینت کیا ہو سکتی ہے۔ اِس سے بڑھ کر خطاب "مردانِ پاکستان" ہو سکتا ہے جو آپ کے محاورے میں نشانِ پاکستان کا مترادف بھی ہوتا اور ہم قافیہ بھی۔ مگر مرد کا لفظ بہت عظمت والا ہے اور جب بھی اور جہاں بھی استعمال ہوا ہے شان کے ساتھ استعمال ہوا ہے مثلاً اقبال کا مردِ مومن اور عوام کا مردِ میدان اور نہ صرف اس لیے میرا روئے سخن مردوں کی طرف نہیں بلکہ اِس لیئے بھی کہ اگر مُردوں کو قبرستان میں مخاطب کیا جائے تو مخاطب کرنے والے کو پاگل سمجھا جاتا ہے۔ مُردوں کو تو مخاطب اُسی وقت کیا جاتا ہے جب اُن سے کہنا ہو کہ تم پر سلام ہو اور اِس سے زیادہ اُن سے کوئی بات کرنی ہو تو یہی کہ ہم بھی عنقریب تمھاری طرف آ رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے مُردے اور جاہل لوگ ایک سطح پر ہیں کیونکہ قرآن کریم میں لکھا ہے کہ جب جہلاء کو مخاطب کیا جاتا ہے تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم پر سلام

ہو کبھی مجھے بھی اپنی نیکی اور اپنی قوم کی نیکی اتنا مغلوب کرتی ہے کہ اُن افراد میں جن کو خدا نے بظاہر سرِ دیدا کیا ہے مجھے زیادہ تر وہی گروہ نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک مردوں کا دوسرا جاہلوں کا۔ اور خوش قسمت اُن میں وہ ہیں جو جاہل ہوں کیونکہ ایک طرف تو مرتے اُن کو ڈر کے مارے سلام کرتے ہیں۔ دوسرے ان کو خود اپنے گرد و پیش کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ سوائے خوشحالی اور پھولوں کے ہاروں کے ـــــ اور آج کل سنت بھی ہے۔

حضرات! مجھے مطلب کی بات کرنے سے پہلے چکر لگانے کی بُری عادت ہے مگر راستہ پہاڑی ہے اور اُوپر چڑھنے میں میرا سانس پھُولنے لگتا ہے۔ یہ میری اپنی مرضی کی بات نہیں کیونکہ میں دمہ کا مریض ہوں، جسمانی طور بھی اور دیگر طور سے بھی۔ آپ اگر اب تک مملکتِ قیاس میں ہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میرا خطاب نوجوانوں اور عورتوں کی طرف اس لئے ہے کہ مردوں کو اس سے پہلے موقع مل چکا ہے کہ وہ اپنے کو ایک زندہ قوم بنائیں مگر جس طرح کسی کو شدت کی نیند آرہی ہو اور وہ سائے کے کپڑے بدلنے کی بجائے صرف گلے کے قریب کا بٹن کھول کر سو جاتا ہے تاکہ گلا گھٹنے سے بچا رہے اور جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے۔ اسی طرح مَردوں نے اپنے نام کا ایک زبر ہی بدل دیا ہے اور زیر و زبر ہو کر مُردوں کی طرح پڑے رہے ہیں۔ اب تک اُن کو چودہ سال اور سات مہینے ہوئے ہیں۔ (۱۹۴۷ء سے آج تک) اور وہ کبھی کبھی ایک آنکھ کھول کر پڑے پڑے حالات کا جائزہ لے لیتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر کہ ہم تو اصحابِ کہف ہیں اور ابھی ہماری نیند کی میعاد نہیں گزری۔ وہ ایک آنکھ بھی بند کر لیتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہُوں کہ وہ آنکھ کھولتے کب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقررہ مدّت کے بعد جیسے کوئی باقاعدہ گھنٹی بجاتا ہو یا پانچ سال اور پانچ مہینے کے باقاعدہ وقفوں کے بعد انھوں نے دو دفعہ آنکھ کھولی۔ مگر ع چشم وا کردہ و جہانے دگرے پیدا شُد

آنکھ کھولی تو ایک نیا عالم تھا یعنی مارشل لا تھا۔ اُن کی نرگسی آنکھیں وُہ حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ جن و ملک یعنی بُرے اور بھلے اپنی پرواز میں رُک جاتے ہیں اختلافِ لیل و نہار نہیں رہتا۔ یعنی رات ہی رات رہ جاتی ہے اور دل و دماغ آئین و قانون سب کچھ معطل ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ پانچ سال اور پانچ ماہ کے بعد۔ اگر کبھی چھ مہینے ہو گئے ہوں تو میرا قصور نہیں۔ ماہِ رمضان کا قصور ہے جو کبھی اٹھائیس دن کا ہوتا ہے کبھی اُنتیس دن کا۔ اور یہ محض ایک روایت ہے کہ کسی زمانے میں تیس دن کا بھی ہوا کرتا تھا۔ تیسواں دن اب عموماً بادلوں میں چھُپا رہتا ہے۔ اب یہ پانچ سال اور پانچ مہینے کا تیسرا وقفہ نومبر یا دسمبر ۱۹۶۷ء میں آئے گا۔ ٹھیک تاریخ کا معیّن کرنا مشکل ہے کیونکہ ایک تو جس چیز کو رُویتِ ہلال کہتے ہیں۔ وُہ ہمیں ستاتی رہتی ہے دوسرے اِس بات کا پتہ نہیں کہ اصحاب کہف اب کے عیسوی سال منائیں گے یا ہجری۔ قائدِ اعظم سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے دسمبر کا مہینہ بہتر ہو گا تاکہ جنم دن کی رونق برقرار رکھنے کے لیئے کوئی اور ہنگامہ میسّر ہو۔ اب تو صرف خیرات ہی کرتے ہیں شاید اس خیال سے کہ مبادا قائدِ اعظم دُوسری مرتبہ پیدا ہوں اور اصحاب کہف کو اپنی میٹھی نیند سے جگائیں یا اس شکریے میں کہ اُن کی وفات ٹھیک وقت پر ہُوئی، ورنہ وہ ہمیں پُوری طرح جگا کر ہی چھوڑتے اور ہماری نیند خراب کرتے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم جاگیں۔ کیا ہم ہی جاگتے رہیں اور لوگ جاگنے کے لیئے تھوڑے ہیں۔

حضرات! بہت سال ہُوئے گوجرانوالہ کے سیشن جج کے دفتر میں ایک سکھ نقل نویس تھا وہ کام نہیں کرتا تھا۔ میں نے اُسے معطل کر دیا۔ ایک دن میں بیٹھا ہُوا میں کھانا کھا کر سگریٹ نوشی میں دُھوئیں اور خیالات کے دائرے بنا رہا تھا کہ یہ نقل نویس بھاگا ہُوا آیا اور میرے پاؤں پہ پگڑی رکھ دی۔ ایک سکھ کے لیئے پگڑی اُتارنا اور اس شخص کے پاؤں پر رکھنا جو تمباکو پی رہا ہو معمولی بات نہیں۔ اُس وقت

مَیں بھی کھانا کھا کر ایک آدھ تولہ بھاری ہی تھا اِس لیئے اُس کے جذبے کی فراوانی سے بھاگ نہ سکا، اُس نے کہا کہ مجھے معاف کر دو۔ مَیں نے کہا تُم کام جو نہیں کرتے۔ اُس نے کہا کہ کام کرنے والے اور تھوڑے ہیں؟ مَیں نے پُوچھا پھر تم کیا کرو گے۔ اُس نے کہا کہ مَیں حضُور کو دُعائیں دیا کروں گا۔ بادشاہ را خوش آمد۔ چنانچہ اُس کو معاف کر دیا۔

صاحبان! جاگنے والے اور تھوڑے ہیں؟ آپ سوتے رہیں اور کبھی کبھی ایک آنکھ کھول کر دیکھ لیا کریں کہ اگر آپ آندھی نہ چلاتے تو خدا ضرور چلاتا اور پھر تو کشتی ضرُور ڈُوبتی۔

مگر اُس سِکھ نقل نویس کو بادشاہ نے کیوں معاف کر دیا؟ اس لیئے نہیں کہ بادشاہت کی لہر میں بہہ گیا یا خوشامد کی لہر میں بہہ گیا بلکہ اس لیئے کہ اُس نے اپنی نالائقی کا اقرار کیا اور یہ کہہ کر کہ میں تو کام اچھا کرتا ہوں نہ جانے آپ کو کیوں پسند نہیں ہے اُس نے اپنی نالائقی کو خیانت کا جامہ نہیں پہنایا اور نہ پراپیگنڈہ کیا کہ مجھے سِکھ ہونے کی وجہ سے تکلیف دی جا رہی ہے حالانکہ اُن دِنوں یہ بہانہ ہر مذہب والے کو حاصل تھا۔ جب آپ کسی سے پُوچھتے کہ سردار لکھن سنگھ تم سے کیوں ناراض ہیں تو وُہ جواب دیتا کہ اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس بات کے کہ میں محمّد دین ہوں۔ مگر اے محمّد دین! تُو نے کبھی دین محمّد بننے کی بھی کوشش کی اور اپنے اعمال کا بھی جائزہ لیا۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ ممکن ہے میں دیانت داری اور محنت سے کام نہیں کرتا ہوں۔ بہر حال اُن دنوں صرف یہی بہانہ میسّر تھا۔ اب اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں میسر ہو گئی ہیں۔" اس کے عادی" اس لیے کہتا ہوں کہ اگر ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کا بہانہ نہیں رہا تو سُنّی، شیعہ، احمدی، دیوبندی، منکرِ حدیث، منکرِ قرآن، ہندی، سندھی، کوہاٹی، پشاوری بلکہ میاں خیل، جنگل خیل (یہ کوہاٹ کے دو محلے ہیں) کا فرق، بہانہ پیدا کرنے کے لیئے ہمیشہ میسر ہے۔ یہ تو ہُوا تعصب کا بہانہ، اس کے علاوہ بھی اور بہت سے بہانے

بیٹھتے ہیں۔ اب اگر آپ نے کسی کے کام سے بیزار ہو کر اُس کے متعلق لکھ دیا کہ اُس نے صفائی کی شہادت لی ہی نہیں اور استغاثے کی شہادت مسل خواں سے لکھوائی ہے تو وہ کہتا ہے کہ صفائی کی شہادت کیا لیتی ہے اور مسل خواں ہوتے ہی کس لیئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میری ترقی کا مسئلہ در پیش تھا اور میرے خلاف ریمارک اس لیئے دیئے گئے ہیں کہ مجھ سے اگلے آدمی کو ترقی مل جائے جس سے سب جج صاحب کو خاص دلچسپی ہے۔ یہ تو ہوئے بہانہ جُو۔ مگر معاملہ اُس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جب آپ کو یہ معلوم ہو کہ واقعی کسی شخص کو اِس لیئے خراب ریمارک دیئے گئے ہیں، کہ اگلے آدمی کو فائدہ ہو۔ یہ باتیں دیکھ کر دل آزردہ ہوتا ہے۔ اس کا تعلق اسوۂ حسنہ سے ہے۔ جس کے لیئے آپ نے پاکستان بنایا تھا تاکہ آپ اپنے اخلاق کی تربیت اپنے طریقے سے کر سکیں۔

اِس آزردگی کے عالم میں اگر میں آپ سے ناراض ہو کر نوجوانوں اور خواتین کو مخاطب کروں تو آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ کو نہیں سننے سے تو نہیں روکتا۔ بلکہ آپ ہی کو تو یہ بات سُنانے آیا ہوں کہ میرا رُوئے سخن اور طرف ہے۔ کہیں میں نے پڑھا تھا کہ کسی شہر کی عورتوں نے اپنے مردوں کی نامردی دیکھ کر اُن کے پاس چوڑیاں بھیج دیں کہ آپ چوڑیاں پہنیں اور مردانہ کام ہم پر چھوڑ دیں۔ اگر اِس تقریر کے زیرِ اثر کسی نے آپ کے پاس چوڑیاں بھیج دیں تو آپ میرے پاس بھیج دیں۔ میں پہنوں گا نہیں۔ یادگار کے طور پر رکھوں گا تاکہ آپ یہ نہ بھول جائیں کہ آپ کو وہ غائبانہ کیا سمجھتی ہیں۔ ۶

سُن تو کہ عورتوں میں تیرا بھی فسانہ کیا

اور اگر چوڑیاں نہ آئیں تو اُس سے بھی بُرا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ آپ کو چوڑیوں کے قابل بھی نہیں سمجھتیں۔

اور اگر آپ میری بات نہیں سُن رہے تو پھر میں آپ کو اُس جج کا قصہ سناؤں گا

جس نے وکیل سے کہا تھا کہ اب تم نے کافی سمع خراشی کر لی ہے۔ اب میں صرف دس منٹ تمہیں اور دُوں گا۔ جب دس منٹ گزر گئے اور اس نے بولنا بند نہ کیا تو دُوسری طرف کے وکیل نے کہا "حضور یہ تو اب بھی بول رہا ہے۔" اس پر جج نے کہا "یہ بلا سے بولتا رہے۔ میں سُن ہی نہیں رہا۔"

میں نے عورتوں اور نوجوانوں کو اس لیئے مخاطب کیا ہے کہ اُن پہ بات کا اثر جلدی ہوتا ہے اور وُہ میری بات سمجھنے سے نہیں گھبراتے۔ جب کبھی میرے دوست مجھے ملتے ہیں تو اُن کی بیویاں بے دھڑک کہہ دیتی ہیں کہ ہمارے بچے تو آپ کی تقریر پڑھ کر جھنڈا ہاتھ میں لے لیتے ہیں لیکن میرے دوست یہ سُن کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں دیوار اور روشنی کے بلب نہ سُن لیں۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وُہ مختصر سی ہے، نیتے، دُوریاں اس لیئے لگا رہا ہوں کہ عورتوں کو پسند آ ئے۔ آپ ماشاء اللہ خود ہوشیار ہیں اور سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ کی بُرائی اس لیئے کر رہا ہوں کہ عورتیں خُوش ہوں اور یہ سمجھ کر کہ اُن کو مردوں پر ترجیح دی گئی ہے وُہ زیادہ شوق سے مائل ہوں ورنہ در پردہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ سے میں اتنا بیزار نہیں ہوں جتنا ظاہر کر رہا ہوں۔ یہ تو محض عورتوں کی خاطرداری ہے اور پھر وُہ بھی تو آپ ہی کی بیویاں، بہنیں اور لڑکیاں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر آج کے بعد سَو میں سے ایک بیوی بھی شام کو اپنے خاوند سے پُوچھے کہ آپ نے آج پاکستان کے لیے کیا کیا تو میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ آپ سے کوئی لمبا چوڑا مطالبہ نہیں کرے گی۔ وُہ آپ سے یہ توقع نہیں کرے گی کہ آپ پاکستان کے لیئے کوئی قلعہ سَر کریں یا اپنی آدھی دولت ملک کے سپُرد کر دیں۔ اور اگر کوئی اور شخص مرتبے حاصل کر رہا ہے تو آپ بھی کریں مگر دیانت داری سے۔ مَیں خُود بھی کوشش میں ہُوں کیونکہ غریب ہونا بذاتِ خُود ایک گُناہ ہے اور غریبوں کے متعلق محاورے بھی تو ملاحظہ ہوں۔ مثلاً غریب کی جورُو سب کی بھابھی۔ یہ بھی غنیمت ہے اور پشتو میں کہتے

ہیں کہ غریب مُلّا کا مسئلہ بھی لوگ نہیں مانتے۔اس لیئے میری بات مانو تو غریب بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں تو جب آپ سے بیوی پُوچھے کہ آپ نے آج پاکستان کے لیے کیا کیا اور آپ یہ کہہ سکیں کہ جو کام میرے سپرد تھا وُہ میں نے دیانت داری اور کوشش سے کیا ہے تو سمجھ لیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

مگر اَے اَصحابِ کہف! یاد کرو وُہ دن جو ۲۳ مارچ کا تھا۔سن ۱۹۴۰ء میں اس شہر لاہور میں تُم نے مسلم لیگ بن کر قائدِ اعظم کی سرپرستی میں پاکستان ریزولیوشن پاس کیا تھا۔اِس سے پہلے تُم "لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا" کی حیثیت رکھتے تھے یعنی قابلِ ذکر چیز نہیں تھے اِس سے پہلے پاکستان محض ایک خیال تھا اور جب اس قرارداد کی رُو سے یہ طے ہُوا کہ اب مسلمان کا مطمحِ نظر اپنے لیئے ایک علیحدہ مملکت پیدا کرنا ہوگا تو اِس کی تائید کرنے والے قیامِ پاکستان کو ایک کُھلا امکانِ بعید ہی سمجھتے تھے۔یہی خیال تھا کہ اگر ہم علیحدہ ہونے کی دھمکی دیں تو شاید ہمیں مشترکہ ہندوستان میں زیادہ حقوق مل سکیں۔میں خود تو وہاں موجود نہ تھا اس لیئے اس بات کی ذمہ داری راوی پہ ہے جو اِس صورت میں راجہ غضنفر علی خاں ہیں اور جو دریائے راوی کی طرح رواں قصّے سنایا کرتے ہیں۔اُن کی روایت ہے کہ اصل قرارداد سر سکندر حیات کی تھی اور وُہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اندر دو صوبے مسلمانوں کے ہوں گے جو امورِ خارجہ اور دفاع کی حد تک دوسرے صوبوں کے ساتھ اشتراک کریں گے۔ مگر قائدِ اعظم نے اس میں دو لفظ تبدیل کر دیئے جس سے قرارداد کا چہرہ بدل گیا۔چہرے پر تو صرف دو خال لگائے گئے۔ایک پنجاب کی کشادہ پیشانی پر، دوسرا بنگال کے چاہِ زنخداں پہ، مگر اُس میں اِتنی کشش پیدا ہو گئی کہ وُہ دو صوبے آزادی کے طالب ہوُئے۔آپ نے سُنا ہوگا کہ ایران میں ایک شاعر تھا جس کا نام خواجہ حافظ تھا اور اس نے خالِ ہندو کے بدلے سمرقند اور بخارا بخشنے کا وعدہ کیا تھا۔

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

شرط صرف اتنی تھی کہ کوئی ہمارے دل کو ہاتھ میں لے ' بدست آرد دلِ ما را ' یعنی محبت سے رام کرلے۔ لوگ سمجھے کہ یہ محض عشقِ مجازی کی کارگزاری ہے۔ مگر آپ نے یہ نہیں سُنا کہ ع

دِل بدست آور کہ حج اکبر است

اِس لیئے دل کا ہاتھ میں لے لینا کوئی جبری کیفیت نہیں بلکہ ایک نفسیاتی معراج ہے مگر حافظ ہر بات کو اپنے رنگیلے طرز میں پیش کرتا ہے اور بدخواہوں نے تیمور کے پاس جاکر اُس کی چغلی کھائی کہ دیکھئے حضور! آپ نے تو اتنی محنت سے سمرقند و بخارا فتح کیئے۔ یہ شخص ایک خالِ سیاہ کے بدلے انھیں مفت بخش رہا ہے۔ یہ چغلی کھانے والے ہر عہد میں ہوتے ہیں اور حافظانِ قلندر منش کے خلاف تیمورانِ زمانہ کو اُکساتے رہتے ہیں۔ خود تو سمرقند و بخارا فتح کر سکتے ہیں نہ بخش سکتے ہیں۔ اور دوں کو بھی بخشش سے روکتے ہیں۔ اور بخشش بھی کس چیز کی؟ صرف ایک فکرِ آزاد کی جو دل کے تاریک ویرانوں میں اُجالا کرے۔ القصّہ تیمور نے ناراض ہو کر حافظ کو بلایا اور اُس سے جواب طلب کیا (یعنی) EXPLANATION مانگا۔ اُس زمانے میں بھی EXPLANATION لیے جاتے تھے اگر تم کہیں ایسی بخشیش کرتے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ یہی غلط بخشیاں تو ہیں جنھوں نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ بادشاہ راضی ہو گیا اور وہ سمجھا کہ میری حالت حافظ سے بہتر ہے مگر حافظ اصلی بات تو اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا مطلب تو یہ تھا کہ ایک خالِ ہندو کے بدلے دو صوبے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ اس شعر کی تعبیر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی گر احتیاط کا پہلو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان ریزولیوشن کے ہندی چہرے پر ایک کی بجائے دو خال لگائے گئے۔ یہ خال کیا لگے گویا چار چاند لگ گئے۔

مگر صرف ریزولیوشن پاس کر لینے سے تو دنیا کا چہرہ بدل نہیں جاتا۔ اب اگر
آل پاکستان قالین بافان ایسوسی ایشن، جو اب تک وجود میں نہیں آئی ہے، یہ ریزولیوشن
پاس کرے کہ پانچ سو سے زیادہ آمدنی رکھنے والے ہمارے قالین استعمال کریں تو اس
ریزولیوشن کا سب سے مؤثر حصہ وہ ہوگا جس کی رو سے ایک ایک نقل ہر پنج سیکڑی
(بر نہج پنج ہزاری) کے پاس بھیجی جائے گی۔ اب قالین استعمال کرنے پر کس کو اعتراض
ہو سکتا ہے۔ جب تک اس پر پیسے خرچ نہ ہوں ہمیں تو اس پر بھی اعتراض نہیں
کہ جب کوئی وزارت ختم ہو تو وزراء کے گھروں کے سرکاری قالین غلطی سے ہمارے
گھروں میں آ جائیں اور ہمارے کم قیمت قالین اُسی غلطی کے اجرا میں سرکار کے گھر پہنچیں۔
پس محض ایک ریزولیوشن کا پاس کرنا کچھ اہمیت نہیں رکھتا جب تک کوئی صاحب
ارادہ، کوئی عزم کا مالک، ایسا پیدا نہ ہو جو اُس میں عمل کی روح پھونک دے۔
ایک صاحب ارادہ تھا جس نے سات سال میں اس افسانے کو حقیقت بنا
دیا۔ وہ کیا بات تھی؟ سردار عبدالرب نشتر نے ایک دن بتایا کہ ایک دفعہ پشاور کے
ضلع میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ جس میں بڑے بڑے صاحبانِ ریش (ریشائیل) اور
ملا بھی تھے اور قائدِ اعظم کو ساتھ لے جا رہے تھے۔ نشتر نے اُن کو خوش کرنے کے
لیے کہا کہ یہ ملا لوگ کسی کی بھی قیادت نہیں مانتے اور خصوصاً ایسوں کی جن کی ریش
ہو نہ بروت، مگر آپ کے سامنے ان سب نے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ قائدِ اعظم نے
جواب دیا "تم جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ میں اپنے لیے
کچھ نہیں کر رہا"۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایسے لوگ مل سکیں جو بے ریائی سے آپ کے
لیے کام کریں مگر اُن سے کام لینے کے لیے ایسا رہنما چاہیے جو اولوالعزم ہو۔
اور اس لفظ میں قوتِ ارادی اس قدر بھری ہے کہ پیغمبروں میں بھی سب کے لیے
یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ میں قائدِ اعظم کے لیے کوئی دعویٔ پیغمبری نہیں کرتا۔ اور نہ

اولوالعزمی صرف پیغمبروں کے لیئے ضروری ہے۔ دنیا کے کام اِس کے بغیر نہیں ہو سکتے اور جتنا بڑا اِرادہ قائم کیا جائے اُتنا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، کہ قوتِ ارادی بہت حد تک ایک خُداداد دولت ہے لیکن اس کا بڑھانا، اس کا استعمال کرنا انسانوں سے تعلق رکھتا ہے مثلاً قائدِ اعظم اکیلے کیا کر سکتے تھے۔ اگر آپ اُن کے پیچھے نہ ہوتے آپ نے اُن کے لیئے یہ ممکن کر دیا کہ وہ پاکستان کا مُطالبہ کریں۔ کیا یہ سب کچھ حاصل کر کے اب آپ غافل ہو جائیں گے۔ تب تو آپ کی مثال اُس شخص کی سی ہو گی جس نے زمین کے حاصل کرنے کے لیئے خُون ریزی اپنے اُوپر جائز کر لی مگر جب زمین حاصل کر لی تو اُس کو بغیر کاشت کیئے چھوڑ دیا بلکہ اُس کی کاشت اور لوگوں کے سپرد کر دی۔ تو میرے عزیزو! اپنی زمین خود کاشت کرو اور پانی کے لیئے نالیاں بھی بناؤ اور جس طرح زراعت والے آپ کو نالی صاف کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اِسی طرح دماغ کی نالیاں بھی صاف رکھو تاکہ پانی کے ٹھہرنے سے عفونت پیدا نہ ہو اور کشتِ خیال مچھروں کی پرورش گاہ نہ بن جائے اور اُس میں تازگی رہے۔ سیکرٹری صاحب کے افتتاحیہ الفاظ پہلے فقرے کو چھوڑ کر مجھے بہت پسند آئے۔ یہ پہلا فقرہ بھی کوئی ایسا بُرا نہیں۔ اُنھوں نے میرے متعلق کہا ہے کہ عدل و انصاف کی دنیا میں تو معروف تھا۔ اب "کچھ عرصے سے" عوام میں بھی مقبول ہو چلا ہوں۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ "کچھ عرصے سے" پہلے میں خاکم بدہن غیر مقبول تھا غالباً ایسے ہی موقعہ پر خاکم بدہن کہتے ہیں۔ یعنی میری کیا مجال کہ ایسی گستاخی اپنے متعلق کروں بہر حال میرا اشارہ اِس سے اگلے جملوں کی طرف ہے جو اس طرح پر ہیں کہ عوام کے نمائندوں کی عدم موجودگی میں میری تقریریں عوام کے اندرونی خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں کیونکہ قدرت کو خلا منظور نہیں۔ یہ آخری خیال کہ قدرت کو خلا منظور نہیں ایک گہرا خیال ہے اور اب تک میرے رمیدہ خیالات اِس سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ اب سوچا تو معلوم ہوا

کہ قدرت کو خلا کا پُر کرنا بھی منظور ہے اور میزان کا قائم رکھنا بھی، اور ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ یوں تو سورۃ الرحمٰن سینکڑوں دفعہ پڑھی اور سُنی ہے مگر سیکرٹری صاحب کی افتتاحیہ تقریر سے اس کے بعض حصوں کی اہمیت واضح ہونے لگتی ہے "خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اُس کو بیان کرنا سکھایا تو آپ اگر اپنا دردِ دل بیان نہ کر سکیں تو گویا اپنی پیدائش کا منشا پورا نہیں کرتے۔

"والسماء وضع المیزان الا تطغوا فی المیزان ۔ واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان" تین دفعہ میزان کا ذکر آیا ہے آسمان کو اُونچا کر کے انسان کے لیے توازن کا اصول قائم کر رہا ہے تاکہ میزانِ عدل میں کمی نہ آنے۔ اور فرمایا، کہ توازن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان کو خسارے میں نہ ڈالو۔ مگر جہاں قدرت نے آپ پر میزان کی اہمیت اتنی صراحت سے واضح کی ہے وہاں اس کا بھی خیال رکھا ہے کہ بعض دفعہ آپ کے خیالات میں طغیانی آجاتی ہے اور دیگر چیزوں کے ساتھ خودداری کا مال و متاع بھی بہہ جاتا ہے۔ اِس لیئے قدرت نے آپ کی سرشت میں بھی توازن رکھا تا کہ اپنے کردار کے باوجود آپ ڈوب نہ جائیں بلکہ تیرتے رہیں مجھے نہ سیاست سے کام ہے نہ سیاست کو سمجھتا ہوں البتہ اِس بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں کہ لوگ بُزدل نہ ہو جائیں۔ اور اُن کے حوصلے پست نہ ہوں اور اُن کے خیالات دب کر اُن کے جذبۂ انسانیت کو مجروح نہ کر دیں۔

مگر اُنے اصحابِ کہف! مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی کُل تعداد کتنی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ تین ہیں اور چوتھا آپ کا کُتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ پانچ ہیں اور چھٹا آپ کا کُتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ سات ہیں اور آٹھواں آپ کا کُتا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر کُتا ہر حالت میں آپ کے ساتھ ہے اور اگرچہ کُتا ایک وفادار جانور ہے اور آپ کو اُن بنیادی اصولوں سے جو خُدا نے آپ کی پیدائش کے ساتھ

تخلیق کیئے تھے وفاداری سکھاتا ہے وہ کبھی کبھی باولا بھی ہو جاتا ہے اور کاٹتا بھی ہے ایک شخص کو باولے کتے نے کاٹا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ میں انجکشن تو لگا دیتا ہوں مگر پھر بھی آپ پر باولے پن کا اثر ہو جانے کا احتمال ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ نوبت آپ کے وصال تک پہنچ جائے۔ بہر حال میں شام کو پھر آؤں گا۔ شام کو گیا تو دیکھا کہ وہ شخص زور شور سے کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر سمجھا کہ وصیت لکھ رہا ہے۔ خوش ہو کر کہا آپ بڑے سمجھ دار انسان ہیں۔ یہ اچھا ہے کہ آپ مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا "کیا مجھے باولے کتے نے کاٹا ہے کہ وصیت لکھوں؟ میں تو اُن لوگوں کی فہرست بنا رہا ہوں جنہیں باولا ہو کر میں خود کاٹوں گا"

حضرات! میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرنے لگا ہوں۔ اِس لیئے بہتر ہو گا کہ آپ سے رخصت لوں۔

اُس میں رس ہے مُجھ میں ہائے ہے

خطبۂ الوداعیہ - لاہور

اکتوبر ۱۹۶۲ء

لاہور کے مُعزّز شہریو!

مَیں نے جب اخبار میں پڑھا کہ لاہور کے شہری مجھے مہمانِ خصوصی بنانا چاہتے ہیں تو پہلے مجھے وہ قصہ یاد آیا جو ڈھائی سال پہلے مَیں نے کراچی میں پاکستان بار ایسوسی ایشن کو سنایا تھا۔ اُس قصّے سے اور قصّے پیدا ہُوئے جو بعد میں قضیّے بن گئے اور اب میرے محتاط دوست کہا کرتے ہیں کہ ان قصّوں کو سو مرتبہ دُہرا چکے ہو زیادہ مت دُہراؤ۔ مگر میرے پاس دُہرانے کے سوا ہے ہی کیا۔ آپ بھی تو سپاس نامے دُہراتے ہی رہتے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک امریکن جرنلسٹ شنگھائی یا ہانگ کانگ میں رہتا تھا۔ ایک دن شہر کے میئر نے اس سے کہا کہ یہاں کے شہری آپ کے اعزاز میں ایک پارٹی دینا چاہتے ہیں۔ جرنلسٹ بہت خُوش ہوا۔ اور اُس نے ایک بلیغ تقریر شروع کی۔ تقریر کے دوران میں میئر نے اُسے روک دیا اور کہا کہ بس یہی کافی ہے۔ شہری تقریر سُننے کے لیے نہیں، آپ کے دانت دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ اُنھیں اپنے دانت نکال کر دکھا دیجیے۔ چنانچہ اُس نے دانت نکال کر دکھائے اور شہریوں نے تالیاں بجائیں۔ پھر دانت واپس مُنہ میں رکھ لیئے اور مُنہ کھول کر دکھایا۔ شہریوں نے پھر تالیاں بجائیں۔ وُہ سمجھے کہ یہ شخص اپنی مرضی سے دانت نکال بھی سکتا ہے اور لگا

بھی سکتا ہے۔ اِس قصّے کے یاد آنے کے بعد یہ خیال آیا کہ آپ لوگوں سے پُوچھوں کہ آپ کس حصّے کے شہری ہیں۔

کبھی کبھی ہم بھی سنتے ہیں کہ فلاں صاحب منظّم جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں جہاں پولیس کا پہرہ بھی ہوتا ہے اور سننے والے بھی سرکاری ہوتے ہیں۔ نذرامُوچی دروازے میں تو تقریر کر کے دیکھیں میں سمجھا کہ موچی دروازہ تقریر کا مرکز ہوگا۔ اِس لیے جب تھوڑے دن ہُوئے مجھے ایک دوست موچی دروازے کے باہر تقریر کرنے کے لیے لے گئے تو مجھے ایک گُونہ اطمینان ہُوا کہ اب مجھے موچی دروازے سے بھی سند مل گئی۔ کم از کم اب مجھے کوئی موچی دروازے کے نام سے ڈرا تو نہیں سکتا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہاں مجھے کوئی موچی نظر نہیں آیا بلکہ دروازہ بھی نہیں تھا۔ اِس کے بعد وُہ ہماری پارٹیاں میرے سامنے آگئیں جو لاہور کے شہریوں کے نام سے شالامار میں شاہی مہمانوں کو دی جاتی ہیں مگر جن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے دنوں کی ایک یاد تازہ ہوگئی جب ۱۹۳۴ء میں ایک اور چیف جسٹس سرشادی لال کو شالامار میں (شہریانِ لاہور کی طرف سے) پارٹی دی گئی تھی۔ اُس وقت یہ بات سُننے میں آئی تھی کہ پارٹی کا اہتمام چیف جسٹس کے ایما پر کیا گیا تھا تاکہ دُنیا دیکھ سکے کہ چیف جسٹس کتنے ہردلعزیز ہوتے ہیں۔ اِس مقام پر پہنچ کر میرا خیال رُک گیا بلکہ یہ کہیئے کہ میرے توسنِ خیال کے کان کھڑے ہوگئے۔ اگر آپ نے کبھی گھوڑے کی سواری کی ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ جب کسی چیز سے گھبرا کر چونکتا ہے تو اُس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہردلعزیزی کے خیال سے میں ٹھٹک گیا اس لیے کہ کبھی کبھی لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ہردلعزیز بننا چاہتا ہوں۔ لوگوں سے میرا مطلب آپ لوگ نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو انگریزوں کی آیا "بابا لوگ" کہتی ہے۔ آپ بھی اُن کو "بابا لوگ" ہی کہیں کیونکہ "بابا لوگوں" کی تربیت کا ایک ضروری حصّہ

گدھے کی سواری ہے۔ اُن کو یہ تربیت اِس لیئے دی جاتی ہے کہ آئندہ زندگی میں وہ ہر ایک کو گدھا سمجھ کر اُس پر سوار ہو جایا کریں۔ مَیں نے تو گدھے کی سواری اُس دن سے چھوڑی ہے جب چھ سال کی عُمر میں میرے ایک ہم عُمر نے مجھے گدھے پر بٹھا کر اُسے چھڑی لگادی۔ مَیں فوراً گر گیا اور میری ناک پھُول گئی اور ہو سکتا ہے کہ ابھی تک پھُولی ہوئی ہو۔ لیکن اُس سے مجھے بہت فائدہ ہُوا۔ ایک تو یہ کہ مَیں "بابا لوگ" کی طرح کسی کو گدھا سمجھ کر اُس پر سوار نہیں ہو جاتا۔ دوسرے یہ کہ میرے خیالات کا گدھا پن صرف ناک تک محدود رہا۔ اُن "بابا لوگوں" کا تو سر تک چڑھ جاتا ہے۔

حضرات! شہریوں کی پارٹی پر تو مَیں اِس لیئے نہیں چونکا تھا کہ ہر دلعزیز بننے پر مجھے کوئی اعتراض ہے۔ آپ میں سے کون ہر دلعزیز بننا نہیں چاہتا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے لوگ اتنے اچھّے ہیں کہ سارا سال پھُولوں کے ہار تیار رکھتے ہیں اور بلا تفریق مذہب و ملّت، بلا تفریق رنگ و بُو، بلا تفریق دل و دماغ ہر ایک کو پہناتے ہیں اور اِس کے لیئے صرف ایک ہی شرط ہے وہ یہ کہ پھُول پہننے والا کسی اچھّے عُہدے پر فائز ہو۔

اخبار پڑھنے کے بعد مجھے اِس ہر دلعزیزی کی اطلاع ایک ایڈووکیٹ سے ملی۔ اس نے کہا کہ وہ بھی اُس کمیٹی کا ممبر ہے جس نے باغِ جناح میں پارٹی دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ آپ شہری نہیں ایڈووکیٹ ہیں۔ جب تک مجھے یہ تسلی نہ ہو کہ یہ دعوت خالص، کھرے، ستھرے شہریوں کی طرف سے ہے جن کو عند اللہ ماجور کہہ سکیں مجھے اِس کے قبول کرنے میں تامّل ہوگا۔ اُس کے بعد شہریوں کا ایک وفد آیا۔ دیکھنے میں اچھے لوگ نظر آتے تھے۔ دلوں کا مالک خدا ہے۔ شکل و صورت سے تو ستھرے تھے۔ بعض نے صفائی کے طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ ہم اُن شہریوں کے ساتھ بھی رہتے ہیں جو شالیمار میں سرکاری مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پھر میاں بشیر نے کھڑے ہو

کہ ایک چھوٹی سی تقریب کی کہ جناب والا! لاہور کے شہری آپ کو الوداعی دعوت دینا چاہتے ہیں اور آپ کے ارشادات سُننا چاہتے ہیں۔

مجھے وہ امریکن جرنلسٹ یاد آیا جس کو میئر نے دانت دکھانے کے لیئے کہا تھا۔ لوگ دانت دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ اِرشادات سُننے آتے ہیں۔ اِرشادات سُنتے سُنتے کبھی کبھی اُس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ اُن کو دانت دکھائے جائیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہاتھی کے دانت ہیں دکھانے کے اور، کھانے کے اور۔ مگر جو باتیں آپ کے نزدیک ارشادات ہیں وہ دراصل میری آرزوئیں بن گئی ہیں اور میری پہلی آرزو یہ ہے کہ اپنے بچوں سے کہوں بیٹا ہم تو ہار پہنانے کے ماحول میں پیدا ہوئے ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو یہی ہار پہناتے دیکھا۔ ہمیں تو عادت ہو گئی ہے مگر خُدا کے لیے تم ہاروں سے دُور رہو۔

مَیں یہ نہیں کہتا کہ آپ کسی کی قدر نہ کریں۔ مَیں یہ کہتا ہُوں کہ آپ کسی کو دھوکا نہ دیں۔ یہ آپ کے بڑے افسر، امیر، وزیر، عموماً اچھے لوگ ہوتے ہیں مگر صبح و شام جھُوٹ سُن سُن کر اِن کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کا ماحول مرطوب آب و ہوا کی طرح ہے۔ جس سے کوتاہ نفسی کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست نے جو پچھلے ہفتے کراچی سے آئے ہیں۔ کراچی کے بعض لوگوں سے کہا۔ عجیب بات ہے کہ آپ اِن موجُودہ حکومت والوں کو بھی اُسی طرح ہار پہناتے ہیں جس طرح اِن سے پہلے لوگوں کو پہناتے تھے۔ یہ بیچارے کیسے سمجھیں گے کہ ہم میں اور ہمارے متقدمین میں کچھ فرق ہے۔ ان لوگوں نے میرے دوست سے کہا کہ آپ سے پہلے پیغمبروں نے بھی ایسی باتیں کی ہیں۔ اگر سچے پیغمبر ہو تو کوئی مُعجزہ دکھاؤ۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ سے پہلی امتوں نے بھی یہی کہا تھا۔ اور اُن کو مُعجزے دکھائے گئے تھے پھر اُنھوں نے کیا عبرت حاصل کی۔ رات کو سوتے تو اچھی بھلی وزارت تھی، صبح اُٹھے تو

کچھ بھی نہ تھا۔ کبھی ووٹوں کی زہریلی ہوا چلی اور باغ جل کر راکھ ہوگیا۔ کبھی لاقانونیت کی مکڑی حُریتِ خیال کے آسمان پر پیلے بادل کی طرح چھا گئی۔ اور سب کچھ پیلا نظر آنے لگا۔
انہی دنوں میں جب لاقانونیت کا دَور دَورہ تھا۔ ایک بہت بڑے شخص نے پشاور یا نتھیا گلی میں چند رؤسا کو تبادلۂ خیال کے لیے کھانے پر بلایا۔ اُن دنوں گندم تیس روپے من تھی مگر گورنمنٹ نے پندرہ سولہ روپے من نرخ مقرر کیا تھا۔ کھانے سے پہلے دو مہمانوں نے آپس میں صلاح کی کہ میزبانِ گرامی کو بتائیں گے کہ اس قیمت پر گندم بازار میں نہیں آتی اور اِس لیئے خُوب زور شور سے بلیک مارکیٹنگ ہو رہی ہے۔ جب کھانے پر بیٹھے تو میزبانِ گرامی نے حاضرین سے ایک عام سوال کیا کہ گندم آج کل کس نرخ پر ملتی ہے۔ ایک شخص نے جھٹ سے کہا کہ یہی بارہ چودہ رُپیے من۔ میزبانِ گرامی یہ سُن کر باغ باغ ہو گئے اور فرمانے لگے کہ دو چار روپے بڑھ بھی گئے تو میں برداشت کر سکتا ہوں۔ اتنے میں ان دونوں میں سے ایک نے مُنہ کھولا کہ صورتِ حال سے میزبانِ گرامی کو آگاہ کرے مگر دوسرے نے اشارے سے روک دیا اور اُس کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ کھانے کے بعد باہر آ کر اُس نے اپنے دوست سے پُوچھا کہ اُس نے صحیح بات بتانے سے اُسے کیوں روکا تو اُس کے دوست نے کہا "کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ میزبانِ گرامی پہلے شخص کی جھُوٹی قیمت سُن کر کتنے خوش ہُوئے تھے آپ اگر انھیں سچی بات بتاتے تو وُہ ناراض ہو جاتے۔ بھائی ہم اپنے میزبان کو ناراض کرنے تو نہیں گئے تھے۔" اس کے بعد میزبانِ گرامی جہاں بھی گئے۔ انھوں نے کہا کہ مُعتبر ذرائع سے مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ جو قیمت حکومت نے مقرر کی ہے وُہ گندم فروشوں کے لیئے کافی منافع کی گنجائش رکھتی ہے۔ چنانچہ ہر منڈی میں گندم کی ڈھیریاں پڑی ہیں۔ یہ آخری بات ٹھیک تھی۔ گندم کی ڈھیریاں اِس لیئے پڑی تھیں کہ عام آدمی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔

صاحبان! یومِ اقبال کے موقعہ پر جناب آغا شورش کاشمیری نے لاہور کے شہریوں کی طرف سے مجھے لسانِ پاکستان کا خطاب دیا تھا اور بعض لوگوں نے اس خطاب کو اس طرح لکھنا شروع کیا جیسے نشانِ پاکستان ہو۔ اُن کے خیال میں فرق صرف اتنا ہے کہ لسان کا لام دل، نشان کے نُون (ن) سے پہلے آتا ہے اور پھر سین (س) نشان کے شین (ش) سے پہلے آتا ہے۔ اور وہ محض ایک نشان ہے اور یہ پوری زبان ہے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا کہ فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے۔ مجھ میں ہائے ہے۔ آپ نے شاید جوانی میں یہ شعر سُنے ہوں، کبھی کبھی اُن کی یاد تازہ کرنے سے زندگی میں تازگی آجاتی ہے۔ ؎

اودپپیہا آ اودھر میں بھی سراپا درد ہوں
آم پر کیوں جم گیا میں بھی تو ویسا زرد ہوں

فرق اتنا ہے کہ اُس میں رس ہے اور مجھ میں ہائے ہے

لسانِ پاکستان کا خیال یوں پیدا ہوا کہ اکثر اوقات لوگ دانستہ طور پر میری تقریروں سے غلط مطالب نکالتے ہیں اور جب سے بابا لوگ نے لسان کا لفظ سُنا ہے وہ کچھ حیرت اور کچھ بے اعتنائی کے ساتھ اپنے کندھوں کو ایک ایسی انگریزی جنبش دیتے ہیں گویا یہ کہہ رہے ہوں۔ ع

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

خُدا کرے کہ میری زبان ترکی ہی رہے کیونکہ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ترکی بہ ترکی کا محاورہ بلا وجہ استعمال نہیں ہوا۔ اگر بعض لوگ ترکی کا جواب لاطینی میں دیتے ہیں جیسے محاورے کے بموجب کوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔ اس مقام پر پہنچ کر مجھے وہ خط یاد آرہا ہے جو کسی نے آٹھ دس دن ہوئے مجھے لکھا تھا خط کا مضمون یہ تھا۔

"نہایت مسرت کا موقعہ ہے کہ آپ عزت و آبرو کے ساتھ دیرتا زندہ رہے ہیں

کیا معلوم ہے میں نے سوچا تو دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھنے کا ارادہ کیا سمجھ نہیں آتا کہ بعض دفعہ لوگ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں جیسے اس عہدے کو جس سے میں آج صبح سبکدوش ہو گیا ہوں میں نے بطور سپر کے استعمال کیا ہو تو کیا اب مجھے یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ آج سے میں بے سپر ہو گیا ہوں۔ مگر کیا شہر لاہور میرے لیئے کافی سپر نہیں ہے؟ کیا پاکستان کے طول و عرض میں بسنے والے میری سپر نہیں ہیں؟ نہ ہی اب سپر استعمال کرنے کا موقعہ ہے میں جس عہد میں ہلکی پھلکی باتوں سے آپ کو بہلاتا تھا، وہ عہد گزر گیا۔ اگر آپ میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو بے قانونی کے عہد کو استقلال دینے کے حق میں تھا تو پھر کیوں اُس عہد کو ختم کر دیا۔ اس پر سب متفق ہیں کہ جمہوریت لاقانونیت کے منافی ہے اس پر بھی سب متفق ہیں کہ جمہوریت دُنیا کی ایک رُوحانی غذا ہے۔ اگر کسی ضرورت کے تحت صاحبانِ اقتدار ایک عرصے کے لیئے جمہوری نظام کو معطل کر دیں۔ تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ رُوح تعطل کے دن تعطیلات کے دنوں کی طرح خوش گوار ہوتے ہیں۔ اُن دنوں سوچنے والے لوگوں کے دل و دماغ پر ایسی پریشانی چھائی تھی کہ اُس کا بوجھ اُٹھانا ہر خیر خواہِ وطن کا فرض تھا۔

حضرات! یہ باتیں میں آپ کو اس لیئے نہیں سُنا رہا کہ مجھے خدانخواستہ آپ کے شہری ہونے پر شک ہے۔ حاضرینِ محفل ہمیشہ نکتہ چینی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں اور اسی طرح وہ مہمان بھی جو صرف آپ جیسے شہریوں کے ہار پہننا گوارا کرتے ہیں اور چونکہ آپ نے اپنے سپاسنامے میں بار بار کہا ہے کہ میں کلمۂ حق کی پشتی بانی کرتا رہا ہوں مجھے کلمۂ حق ہی کہنا پڑے گا۔ اور حق یہ ہے کہ اس طرح کی عزت افزائی کم لوگوں کی ہوتی ہے۔ آپ کے دل میں جو خوشی آج پیدا ہوئی ہے میرا شکریہ اسی میں مضمر ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ سچائی نے مجھ سے اپنی قیمت وصول کر لی ہے۔ ایک دفعہ میں بیمار ہوا تو کسی نے اپنی زندگی کے پانچ سال مجھے بخش دیئے تھے۔ وہ سال

مَیں نے ابھی ریزرو میں رکھے ہیں جو اٹھارہ اکتوبر کے بعد شروع ہوں گے مگر کیا مَیں اس چیز کے بدلے جو لاہور نے مجھے آج دی ہے اِتنی بھی بخشش نہیں کر سکتا۔ میرے قرآنی باپ نے جنّت، دانۂ گندم کے بدلے بیچ ڈالی۔ میرے رُوحانی باپ نے ایک سیاہ خال کے بدلے سمرقند و بُخارا بخش دیئے۔ آج کی خوشی میں اگر مَیں پانچ سال رُونے میں بھی بسر کروں تو کم ہیں۔ ویسے میں رویا نہیں کرتا۔ نہ مجھے ہنسی زیادہ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے زیادہ منافقوں سے کہتا ہے کہ تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کریں گے میں کہتا ہوں کہ تم بھی ہنسو اور ہم بھی ہنسیں گے۔ مَیں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ڈیڑھ ماہ کے اندر حکومت کو صلاح دی کہ اُن کے ٹھیک مقاصد کے پیشِ نظر اُن کے لیے ایسا طرزِ عمل مناسب نہیں جس سے لوگوں کے دل بیٹھ جائیں۔ آپ اِسے ایک عارضی بے آرامی سمجھیں اور آپ کے ذہن پچھلی غلامی سے بھی بڑھ کر غلامی میں پرورش نہ پائیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ذہنِ بشری پر اگر زیادہ دباؤ پڑے تو وُہ پست خیالی میں مُبتلا ہو جاتا ہے اور ایک قوم اِس طرح نہیں بنتی کہ اُس میں دس پندرہ آدمی تو بلند خیال ہوں اور باقی ملک میں کہیں بلند خیالی پیدا ہو تو اس کا گلا گھونٹ دیا جاتے۔

پچھلی گرمیوں میں مَیں ایک دفعہ ایبٹ آباد جا رہا تھا۔ موٹر میں سامان زیادہ رکھا تھا۔ اُس کی کمانیوں پر غیر معمُولی بوجھ پڑ رہا تھا۔ جب ہم چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھتے اور سڑک کے نشیب و فراز سے موٹر اُچھلتی تو موٹر کا نچلا حصّہ سڑک سے رگڑ کھاتا اور ہمیں مجبوراً رفتار کم کرنی پڑتی۔ حضرات! یہ شاہراہیں باوجُود اپنی وُسعت کے شیشے کی تو ہیں نہیں کہ اُن میں نشیب و فراز نہ ہوں۔ یہ شاہراہیں ناہموار ہیں۔ اور اگر ان پر ہماری موٹریں اِتنے بڑے بوجھ لے کر چلیں تو اُن کی رفتار چالیس میل سے کم رکھنی پڑے گی اور زمانہ ہم سے بہت آگے نکل جاتے گا۔ اور اگر یہ بوجھ اُن پر زیادہ دیر رہا تو کمانیاں بھی ٹوٹ جائیں گی۔

بس میرا رول اُن دنوں میں یہی تھا کہ آپ کا دل بہلاؤں۔ جس زمانے میں میں سیشن جج تھا۔ ایک دفعہ ایک بڑے عہدے سے جو میرے لائق نہیں تھا یا شاید جس کے میں لائق نہیں تھا مجھے محروم رکھا گیا۔ والد مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی تکلیف آتی تو کہتے کہ اسی میں خیر ہوگی۔ اس مرتبہ بھی اُنھوں نے کہا کہ اسی میں خیر ہوگی۔ اب تم سیشن جج کی حیثیت سے ہر مہینے دس بارہ دن کچہری میں آکر کام کرتے ہو۔ ہمارے پاس رہتے ہو، ہمیں بڑھاپے میں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اگر تمھیں ترقی ملتی تو پھر ہم سے ملنے کم آتے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں توازن کھو کر کہا "آپ ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی چھوٹے بچے کو بہلاتا ہے۔" والد مرحوم نے زہر مسکراہٹ سے جس کی تہ سے میری بے خبر مستحکم اور مضطرب انسانیت اپنی جگہ پیدا ہو آجاتی ہے' فرمایا "تو میں یہ کہتا کہ اس میں خیر نہیں ہے اور یہ جو تمھیں ترقی نہیں ملی تو تم اس کا خیال کر کر کے اپنا دل جلاتے رہو۔ میں بھی آپ سے یہی کہتا ہوں کہ آیا وہ اچھا تھا جو میں نے کہا یعنی اس میں خیر تھی۔ اور خزاں کے بعد بہار بھی آتی ہے یا یہ اچھا ہوتا کہ میں آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتا اور آپ کسی ایسے شخص کے ہاتھ پڑ جاتے جو آپ کو مایوس کرتا اور کہتا کہ اس میں کوئی خیر نہیں۔

اب میرا رول ختم ہو گیا ہے۔ اب آپ خود اپنا حال بیان کر سکتے ہیں۔ نظر بد دُور اب طوطی کے علاوہ اور بہت سے بولنے والے پیدا ہو گئے ہیں مگر طوطی کی آواز نقارخانے میں کون سنتا ہے۔

اے شہر لاہور کے رہنے والو! آپ کو اس کا احساس نہیں کہ آپ کتنی ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کا شہر پاکستان کا ثقافتی مرکز ہے۔ آپ کا شہر عروس البلاد ہے۔ جس طرح حکومت کے چند افراد سارے ملک کی رہنمائی کرتے ہیں اُسی طرح بڑے شہروں کے رہنے والے اپنی ثقافتی برتری اور اپنی ذہنی فوقیت سے دیہات

کے رہنے والوں کے رہنما بن جاتے ہیں۔ آپ ہمارے ملک کی بہبُودی کے ضامن ہیں
آپ ہمیشہ شہری آزادی ہی کا شہرہ سنتے آئے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ دیہات
آزادی سے محروم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آزادی کا احساس شہروں میں پہلے
پیدا ہوتا ہے اور شہری آزادی پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ آپ کے شہر نے مجھے خطاب
بھی دیا ہے۔ آپ کے شہر نے مجھے مزید اعزازات عطا کیئے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ
مجھے اِس شہر کی آزادی بھی مِل جاتی۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ جب کوئی مُمتاز شخص انگلستان
جاتا ہے تو لندن کا لارڈ میئر اُس کو بلدیہ لندن کی آزادی دے دیتا ہے۔ جس کو

FREEDOM OF THE CITY OF LONDON

کہتے ہیں۔ اگر لاہور کی شہری آزادی مجھے مل جاتی تو کبھی میں موچی دروازے کے اندر چلا
جاتا اور کبھی باہر اور چُونکہ دروازہ وہاں کوئی نہیں ہے اس لیئے اندر جانا بالکل آسان ہے۔
مدّت ہُوئی مَیں نے اختر شیرانی کے کچھ رُومانی اشعار پڑھے تھے اور پھر اِس
اُمید پر یاد کر لیئے تھے کہ اگر کبھی حسبِ حال ثابت ہُوئے تو جو اُن کا اہل ہوگا اُسے
سُناؤں گا۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ وُہ اشعار لاہور کے شہریوں کے سامنے پیش کرُوں جو
انار کلی اور موچی دروازے سے، بادامی باغ اور شاہدرے سے اور نہ جانے کہاں کہاں
سے آتے ہیں۔ جنھوں نے پندرہ سال پہلے ڈنڈوں کے ساتھ تلواروں اور بندُوقوں
کا مُقابلہ کیا تھا۔ وُہ غالباً مجھے شہری آزادی دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ وُہ اشعار یہ ہیں ؎

مُدّت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا
جب راتوں کو روتا رہتا تھا جب راتوں کو آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا، پر تُم سے کہتے ڈرتا تھا
آج اُس کی جسارت کرتا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہُوں

اِس میں جو مُبالغہ ہے اُس سے درگزر کیجیئے۔ راتوں کو مَیں نہیں رویا، دن ہی کافی تھے سو جان سے
بھی نہیں مرا۔ ایک ہی جان کافی تھی، حاضر ہے۔

جو دل میں ہے آنا صنم بن کے آ

پشاور کے کلچے

میرے عزیز شہریو!

بہت دنوں کی بات ہے کہ گاؤں میں ہمارے پڑوس میں ایک مُلّانی رہتی تھی۔
اُس نے اپنی پوتی کی شادی بارہ تیرہ برس کی عُمر میں کر دی۔ اُس کے بعد ہر سال بلا ناغہ ایک
بچّہ ہونے لگا۔ اِس مذکر کے صیغے میں مؤنث بھی شامل ہے۔ وُہ نوعروس چوبیس سال تک
دُلہن بنی رہی۔ عورتیں ملنے جاتیں تو ہمیشہ ایک ریشم کے رُومال سے اُس کا سَر بندھا ہوا
دیکھتیں۔ اس کے چہرے پر ایک دائمی اطمینان نظر آتا تھا۔ وُہ کہا کرتی تھی کہ یا تو ہمیشہ شادی
ہوا کرے یا ہمیشہ بچّے ہُوا کریں تاکہ میں یُونہی بن سنور کے بیٹھی رہا کروں اور لوگ پُوچھنے آیا
کریں۔ زرد چہرے پر سیاہ رُومال ویسے ہی اچھا لگتا ہے خصوصاً اگر آنکھوں میں ہلکا سا
سُرمہ لگایا جائے اور آنکھوں کے باہر ہلکا سا خط کھنچا ہُوا ہو۔

حضرات! یہ الوداعی پارٹیاں جو لاہور سے شُروع ہوئی ہیں اور نہ جانے کہاں ختم
ہوں مجھے اُس لڑکی کی یاد دلا رہی ہیں جو چاہتی تھی کہ ہمیشہ مرکزِ توجّہ بنی رہے۔ میرا دل چاہتا
ہے کہ میں بھی ہمیشہ ریٹائر ہوتا رہوں۔ آپ نے مجھے دو سال قبل کیوں نہیں بتایا کہ ریٹائر
ہونے پر میں اس قدر ہر دلعزیز ہو جاؤں گا۔ حکیم احمد شجاع نے پچھلی گرمیوں میں ہر دلعزیز کے
لفظ پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ دُوسری جگہوں پر آپ بے شک ہر دلعزیز ہوں لیکن

لاہور میں ہم محبوب کا لفظ استعمال کریں گے۔ اُن کو معلوم نہیں کہ پشاور کے لوگ جب عشق و محبت کرتے ہیں تو پھر کوئی حد اُن کی نظر میں نہیں رہتی۔ پشاور سے میرا تعلق صرف چار سال رہا ہے اور وُہ میری زندگی کے بہترین سال تھے۔ آپ کے سپاسنامے کی صداقت کے متعلق میری رائے کچھ بھی ہو یہ تسلیم کرتا ہُوں کہ مَیں نے زندگی کی چار بہاریں یہاں گزاری ہیں۔ اور اس شہر کے جن گلستانوں میں یہ گزریں وُہ ایڈورڈز کالج، شاہی باغ اور وزیر باغ تھے۔ شاہی باغ میں ہم فٹ بال کھیلنے جایا کرتے تھے۔ میرے دوست پیر بخش خاں جو غالباً سپاسنامے کے مصنّف بھی ہیں فٹ بال نہیں کھیلتے تھے۔ وہ کالج کے دنوں میں بھی سیاست میں ڈوبے ہُوئے تھے۔ جب وُہ کالج میں داخل ہُوئے تو میں ایک سال آگے تھا۔ آپ نے سُنا ہوگا کہ کالج میں طلُبا، پہلے سال کے لڑکوں کو تختۂ مشق سمجھ کر خُوب بناتے ہیں مگر جس سال پیر بخش خاں پہلے سال کے طالب علم تھے تو اُن کی کلاس کے طلُبا، کالج کے باقی لڑکوں کو بنایا کرتے تھے۔ اُن کے لیڈر چار لڑکے تھے۔ یاد نہیں کہ اُن کے متعلق چہار یار کا لفظ پہلے کس نے استعمال کیا تھا۔ پیر بخش، دوست مُحمّد، خواجہ محمد اشرف اور چاچا یُونس۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ چاچا کا لفظ اُن کے لیے کیوں استعمال کیا جاتا تھا لیکن وُہ شرُوع سے ہی چاچا کہلاتے تھے۔ اب ممکن ہے کہ دادا کے مرتبے تک پہنچ گئے ہوں۔ بعض لوگ ساری عمر ہی چاچا بنے رہتے ہیں۔ ایک دن ہم کالج سے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے پاس سے گزر ہُوا۔ چند سفید ریل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مَیں نے کہا کہ یہ چیف کمشنر کی مخصوص ٹرین ہے۔ چاچا یُونس بولے۔ رستم تب مانوں گا کہ اِس ٹرین کے عہدے تک پہنچو۔ وہاں تک تو مَیں نہ پہنچ سکا لیکن اگر آپ کے دلوں تک پہنچ گیا ہُوں (اور آخر آپ کو جھُوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے) تو پھر سفید ٹرین کی کیا حیثیت ہے۔ ایک وجہ وہاں تک نہ پہنچنے کی یہ بھی ہے کہ ریل گاڑیوں کے ڈبے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگے ہیں اِس لیے سال دو سال سے زیادہ کوئی

مسافر اُن میں سفر نہیں کرتا۔ میں چہار یار کی لیڈرشپ کا ذکر کر رہا تھا۔ یہی پہلے سال کے طالب علم تھے جنھوں نے ایک دفعہ سارے کالج میں سٹرائیک کرادی تھی۔ اُن دنوں لڑکے اِس وجہ سے ہڑتال نہیں کرتے تھے کہ امتحان سخت ہیں یا سرکار کی پالیسی نرم ہے اُن دنوں ہم سیاسی آزادی مانگ رہے تھے۔ ہماری ساری عمر آزادی مانگتے مانگتے گزر گئی اور شاید یہی حسرت لے کر ہم مر جائیں گے۔ ویسے مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے جب میں شہر پشاور کے قصہ خوانی بازار میں شہیدوں کی یادگار کے قریب موٹر کھڑی کرتا ہوں۔ ایک دفعہ کسی شخص نے مجھ سے کہا کہ وہ خود تو اِتنا دلیر نہیں کہ جیل خانے میں جانے کے لیئے تیار ہو لیکن اگر کوئی اور شخص جیل جا رہا ہو تو وہ اُس کی قدر کرتا ہے۔ اور اگر پھول قریب ہوں تو ہار بھی پہنا دیتا ہے۔ بس اِس قسم کی تسکین مجھے بھی یادگار شہیدانِ آزادی کے پاس موٹر کھڑی کرنے پر ہوتی ہے۔ یہ اَور بات ہے کہ یادگار کے قریب ایک گلی میں نمکین کلچوں کی بھی ایک دکان ہے اور اس سے بہتر نمکین کلچے پشاور میں کہیں نہیں ملتے۔ پچھلی گرمیوں میں تو میں نے دکان والے سے کہا کہ آپ کے کلچے بھی سیاست کی طرح بے مزہ ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ زلفِ ایاز میں وہ خم رہا اور نہ آزاد پاکستان کی آزادی میں وہ چاشنی۔ نہ آپ کے کلچوں میں وہ ذائقہ۔ اُس نے کہا وہی انڈے ہیں، وہی میدہ ہے۔ وہی میں ہوں۔ میں نے کہا کھانے والے بھی وہی ہیں۔ مگر شاید آپ گندے انڈے بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ اُس نے تسلیم تو نہیں کیا مگر یہی گندے انڈے تو ہیں جن سے ہم برباد ہو گئے ہیں اور جن سے کلچوں کا خمیر خراب ہو گیا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ جو انڈے استعمال کیئے جا رہے ہیں اُن میں کتنے انڈے گندے ہیں اور کیا ایک گندی مچھلی کی طرح وہ بھی اور انڈوں کو گندا کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں گندے انڈوں کے تعین کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اِس لیئے کہ اقبال نے تو سب ہی کے بارے میں حکم لگا دیا ہے۔ ؎

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

نتیجہ یہ ہے کہ اب نہ وُہ عشق میں گرمی رہی، نہ پشاوری گلیوں میں وہ شوخی، مگر پھر بھی ہر
دَور میں یہ کوشش رہتی ہے کہ گندے انڈوں کو الگ کر کے ایبڈو کر دیا جاتے اور
اب یہ ایبڈو ایک قسم کا سرد خانہ بن گیا ہے جس میں سنگترے مالٹے اور آم کے علاوہ
گندے انڈے بھی رکھے جاتے ہیں پچھلی گرمیوں میں میں ایبٹ آباد میں بیمار تھا تو
ایک مُربی نے ایک پیٹی مالٹے کی پشاور کے کولڈ سٹوریج سے نکال کر بھیج دی۔ وہ دن
بعد اُن مالٹوں پر سیاہ داغ پڑ گئے اور ذائقہ بھی بدل گیا کسی نے تشریح کی کہ یہ حضرات'
یعنی سنگترے مالٹے' جب سرد خانے میں رہتے ہیں تو اُن کی زندگی معطل ہو جاتی ہے
سرد خانے سے نکلتے ہی اپنی اُسی حالت پر واپس آ جاتے ہیں جو سرد خانے سے پہلے
تھی، چنانچہ اب ایسا نظر آتا ہے کہ یہ گندے انڈے، یا جن کو آپ نے گندا کہا تھا،
ایبڈو کے سرد خانے میں رہ کر صحیح و سالم ہو گئے ہیں۔ اور اس لیئے آپ یا تو "مارچ از
ایں قصہ" کہہ کر جب انڈوں کو گندا کہا جاتے تو کہیں کیا مضائقہ ہے اور جب انڈوں کو
اچھا کہا جاتے تب بھی کہیں کیا مضائقہ ہے اور یہ صورت آرام کی ہے کیونکہ آپ کو سوچنا
نہیں پڑتا۔ یا پھر اگر فطرت نے آپ کو سوچنے کی لعنت میں مبتلا کیا ہے تو ایک ذہنی
انتشار کے عالم میں آپ اپنے ضمیر سے پُوچھیں کہ کیا سچ مچ یہ انڈے گندے تھے یا
سیاست میں انڈے گندے ہی ہُوا کرتے ہیں۔

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا میں تو کہنے کو تھا کہ ایک دفعہ پیر بخش کی جماعت نے
کسی سیاسی تحریک میں سالانہ کالج کو بند کروا دیا تھا اور پھر لڑکوں کا جلوس نکالا تھا مجھے
پہلے ہی احساس تھا کہ کچھ معرکہ ہونے والا ہے اِس لیئے چھٹی کی درخواست بھیج دی کہ
میں "ستقین" ہُوں یعنی بیمار ہُوں اور یہ ستقین کا لفظ حضرت ابراہیمؑ سے سیکھا ہے چنانچہ
میں کتابیں لے کر وزیر باغ چلا گیا۔ کیونکہ بیماری عافیت طلبی کی تھی۔

یہ چار سال تو کالج کے تھے اس سے پہلے میں دوسری اور تیسری جماعت کا طالب علم

رہا تھا۔ اُس وقت میرے والد صاحب گور ٹھڑی میں رہتے تھے وہاں سے اسلامیہ سکول تک ڈیڑھ میل کا راستہ ہے واپسی پر بھوک لگتی تھی تو میں دُکان سے ایک کُلچہ خریدتا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ پشاور میں میری زندگی زیادہ تر کُلچوں کی خریداری میں گزری ہے مگر اُس دن میں نے کُلچہ نہیں خریدا کیونکہ پیسہ نالی میں گر گیا تھا اور نالی گندے پانی کی تھی اور پھر گہری بھی تھی۔ میں رونے لگا مگر ایک ہم جماعت کے آنے پر شرمایا اور غم و غصہ سے کر چل دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری قسمت میں یا تو گندے انڈے ہیں یا گندی نالیاں۔ اِن گندی نالیوں میں اگر کسی کا ایک پیسہ بھی گُم ہو جائے تو وہ اُس کے لیئے بچپن سے لے کر ساٹھ برس تک روتا ہے اور اس کو روتا دیکھ کر ہم ہنستے ہیں۔ جب وہ ایک پیسے سے کچھ زیادہ قیمت والی چیزوں مثلاً بنیادی حقوق کے لیئے محض رونے کی شکل بناتا ہے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ حقوق واقعی بنیادی ہیں اور اُن کو کھو دینے میں کسی کو تامل نہیں ہے تو کیا ہم اپنی بنیاد ہی نہیں کھو رہے ہیں؟

حضرات! اِن سپاسناموں میں جو اب تک میرے متعلق مرتب ہوئے ہیں ایک بات جو بار بار میرے نوٹس میں لائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی زبانیں گنگ تھیں تو میں اُن کی طرف سے بولتا رہا اور جب شاہراہِ حیات آنکھوں سے اوجھل کر دی گئی تھی تو میں اُسے شعلوں سے روشن کرتا رہا۔ کیا اِس کا مطلب یہ نہیں کہ پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں گنگ کر دیا گیا تھا اور ہمارے راستے تاریک کر دیئے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ کبھی کبھی گنگ ہونے میں فائدہ ہو۔ اگر صاحب بصیرت کہے کہ ہمیں گنگ رہنے میں فائدہ رہا تو پھر یہی ٹھیک ہو گا۔ بس مجھے یہ ڈر تھا کہ گنگ رہ کر لوگ کسی اور زیادہ خطرناک مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ایک دفعہ ایک بہادر افسر لڑائی میں مارا گیا۔ جب اُس کی لاش گھر پہنچی تو اُس کی بیوی بجائے رونے کے لاش کی طرف گھورتی رہی۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو سمجھے کہ اگر اُس کی یہ حالت رہی تو جلد ہی مر جائے گی کیونکہ غم میں رونا ایک فطری امر ہے

اور رونے سے دل و دماغ پر دباؤ پڑتا ہے۔ ایک سن رسیدہ عورت نے جب یہ دیکھا تو اس کے شیرخوار بچے کو اس کی گود میں ڈال دیا۔ بچے کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی "میرے لال! اب میں تیرے لئے جیوں گی۔" میں نے تو اتنا ہی کیا کہ اُن کی گود میں اُمید کا بچہ ڈال دیا اور رُلانے سے مُراد یہ تھی کہ ایک تو غم اُن کو نہ کھا جائے اور دوسرے اپنے ماضی کی بدعنوانیوں پر روئیں۔ محترم میں نیک لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو خود روئے یا رُلائے یا رونے کی صورت بنائے تو وہ داخلِ جنت ہو جاتا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اِن تینوں باتوں میں سے میں کون سی صورت کا ذمہ دار تھا اور دوسرے لوگ کون سی بات کے۔ مگر تینوں صورتیں ثواب کی تھیں اور کم از کم میں آپ کے دل کی جنت میں تو داخل ہو گیا۔

اگر میں نے اس طرح کیا تو اس خیال سے کہ ہم سب لوگ ایک ہیں، ہم سب کا مقصد ایک ہے اور ہم سب کا مطمحِ نظر ایک ہے یعنی قوم کو سدھارنا۔ میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ میں قوم کی اصلاح کے لئے کوئی مشن لے کر آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بات میں نے کسی خاص ارادے سے نہیں کی۔ تقریریں لکھتے وقت کوئی خاص مقصد میرے پیشِ نظر نہیں ہوا کرتا تھا لیکن لکھتے لکھتے کوئی خاص مقصد خود بخود کھنچ آتا ہے اور کیونکہ ایک طرف مجھے اپنے خلوص پر اور دوسری جانب آپ کے خلوص پر اعتماد تھا۔ میں نے بلا تامل اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ اس بات کا میں نے اُس وقت بھی اعتراف کیا اور اب بھی کرتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے تو اُس چیز کو جسے آپ مشکل کہتے ہیں آسانی سے سمجھا سکتے تھے۔ بہرحال مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کم از کم پڑھے لکھے طبقے میں ایسے بھی سوچنے سمجھنے والے لوگ ہیں جو نازک موقعوں پر کتابیں لے کر وزیر باغ نہیں چلے جاتے۔ جب وہ سوچتے ہیں تو ملک کی ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ مجھے وہ ذہنی رجحانات نظر آ رہے ہیں جن سے قومیں بنتی ہیں اور اس کا ثبوت اس

شہر کے سپاسنامے میں شدت سے پایا جاتا ہے مگر آپ کے سپاسنامے کا کیا کہنا۔
مَیں نے ذرا غور سے دیکھا تو اُس میں ایک صنعت یہ بھی نظر آئی کہ ہر پیراگراف کے شروع میں مجھے ایک علیٰحدہ نام دیا گیا ہے اور پیراگراف کا مضمون اُس کی تشریح کرتا ہے مثلاً جہاں مجھے 'مجاہدِ ملت' بنایا ہے وہاں شہریوں کے بنیادی حقوق کی نگہداشت میرے سپُرد کی ہے اور جہاں مُعزز رہنُما کہا ہے وہاں تنگ و تاریک رستوں کو روشن کرنے کے لیے میرے ہاتھ میں مشعل دے دی گئی ہے اور جہاں 'مشفق دوست' بنایا گیا ہے۔ وہاں قوم کی قُوتیں بیدار کرنے اور صحیح شعور پیدا کرنے کی خدمت مجھے تفویض کی گئی ہے۔ جہاں فاضل ادیب کا خطاب دیا ہے وہاں طرزِ بیان میں کشتِ زعفران کا رنگ و بُو اور گریہ ہائے بے اختیار کا سیلاب نظر آتا ہے البتہ ایک خطاب میری سمجھ میں نہیں آیا یعنی جہاں "واجبُ الاحترام بزرگ" کہا ہے وہاں اُن اعتراضوں کی طرف اِشارہ ہے جو میری تقریروں پر اِس وجہ سے ہُوئے ہیں کہ تقریریں کرنا ایک جج کے منصب کے منافی ہے۔ آپ نے اِس کا اچّھا جواب دیا ہے۔ مگر اِن اعتراضوں کی وجہ سے میں کیوں واجبُ الاحترام بزرگ بن گیا۔ شاید آپ کا خیال یہ ہو کہ لوگوں کو اس بات کا زیادہ احترام کرنا چاہیئے کہ ایک جج بھی اپنے منصب میں بے قرار ہو سکتا ہے۔

جج کا دِل سنگ و خشت کا نہیں ہوتا۔ مگر اس پیراگراف میں آپ مجھے ڈارلنگ جسٹس کہتے تو شاید موزوں ہوتا کیونکہ جسٹس ڈارلنگ بھی تقریریں کیا کرتے تھے اور یوں بھی ڈارلنگ کا لفظ اچھا ہے۔ آپ نے اعتراضوں کا جواب یہ دیا ہے کہ شائستہ قوموں نے عدل و انصاف کے تصوّر کی تشکیل اِس طرح کی ہے کہ اِس کا مجسّمہ یا تو ایک آنکھ کے ساتھ بنایا ہے یا بغیر آنکھ کے۔ ایک آنکھ سے مُراد یہ ہے کہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھا جائے اور اندھا ہونے سے یہ مطلب ہے کہ انصاف کی ترازو چشمِ ظاہر بین

کے فریب سے متاثر نہیں ہوتی۔ انصاف کا مجسمہ بینائی سے تو محروم ہوتا ہے لیکن گویائی سے محروم نہیں ہوتا۔ یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ اُس کے ہونٹوں پر مُہر ہو یا وہ سلے ہوئے ہوں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ مجسّمے کا لفظ نہیں سمجھتے۔ وہ اُسے بُت کہتے ہیں اور بُت تو جبھی دلپذیر ہوتا ہے جب صنم بن کے آئے ورنہ جب لوگ کہتے ہیں کہ بُت کی طرح کیوں کھڑے ہو تو اُن کے کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آخر مُنہ میں زبان رکھتے ہو، دل میں تڑپ رکھتے ہو، سَر میں سمجھ رکھتے ہو کچھ تو مُنہ سے بولو۔ اب یہ تو صاف بات ہے کہ اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ آپ کے دلوں میں بُت بن کے اُتروں یا صنم تو میں صنم بن کے آنا پسند کروں گا اور اسی طرح آپ کا شکریہ بھی ادا کر سکتا ہوں۔ ص

جو دل میں ہے آنا صنم بن کے آ
خدا بن کے آنے سے کیا فائدہ

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

خطبہ افتتاحیہ فیروز سنز راولپنڈی

جون ۱۹۶۲ء

• بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ جون کے مہینے میں آخر راولپنڈی میں ایک اشاعتی ادارے کا افتتاح کیوں ضروری ہے؟ اور پھر ایک چیف جسٹس اس کا افتتاح کیوں کرے؟ ممکن ہے کہ یہ سوالات آپ کے ذہن میں پیدا ز ہوں۔ اور جب وہ آپ کے ذہن میں آئیں گے تو ان کے جواب سوچنے کے لیے وقت درکار ہوگا۔ مگر اس اثنا میں مجھے ڈاکٹر وحید کے ارادوں کے بارے میں آپ کے ذہن میں شکوک پیدا کرنے کا مسرت بخش موقع مل گیا ہے اور آپ کو اور زیادہ سراسیمہ کرنے کے لیے میں آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ ان کے اصل پروگرام کے مطابق یہ تقریب جون کے عین وسط میں منعقد ہونے والی تھی۔ جب گرمی کی لہر آنے کے زیادہ امکانات ہوتے اور جب قومی اسمبلی کا جس کا اجلاس ۸ جون کو شروع ہونے والا تھا — اپنے فلسفے کی وضاحت کے لیے پورا ایک ہفتہ مل چکا ہوتا۔ ڈاکٹر وحید نے سوچا تھا کہ انھیں یہ فیصلہ کرنے کا موقع دینے کے لیے سات دن کافی ہوں گے۔ . وہ اپنے تخیل کو اسمبلی میں پیدا ہونے والی گرمی سے آگ بھبوکا کریں یا موسم سے پیدا ہونے والی گرمی کی لہروں سے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسمبلی کا خیال ڈاکٹر وحید کے ذہن

میں نہیں تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنا خطبہ اُردو میں نہ لکھتے۔ آپ نے ابھی ابھی جو خطبہ سُنا ہے وہ دراصل ترجمہ ہے بالکل اسی طرح جیسے وہ رستم جس کا خطبہ میں نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے شہرۂ آفاق افسانوی ہیرو کا محض ایک عکس ہے، ایک خراب عکس، بلکہ درحقیقت قلب ماہیت ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ سیستان کا رستم جب زمین پر چلتا تھا تو اُس پر کیا افتاد پڑتی تھی وہ اتنا طاقتور اور تنومند تھا کہ جب وہ ریگ زار میں چلتا تھا تو اس کے پاؤں ٹخنوں تک ریت میں دھنس جاتے تھے اُن دنوں پختہ سڑکیں نہیں ہوتی تھیں اس لیے اُس نے خدا سے دُعا کی کہ اُس کی تھوڑی سی طاقت واپس لے لی جائے۔ اُس وقت زمین پر بہت زیادہ انسان نہیں تھے اور خدا بغیر کسی واسطے کے دعائیں سُن سکتا تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ جب خدا زمین اور اس کی خلافت کی تخلیق کر رہا تھا اُس وقت اگر آج کل کے سیکرٹری، وزیر اور مُشیر اُس پاس ہوتے تو وہ کیا مشورہ دیتے۔ فرشتوں نے دربارِ خداوندی میں عرض کیا کہ انسانوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ وہ اسمبلی میں تقریریں کرتے ہیں، اپنی تیز زبانوں سے خون بہاتے ہیں اور بنیادی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس فرشتوں کا طرزِ عمل ملکوتی ہوتا ہے وہ خُدا کی شوکت و عظمت کے گیت گانے کے سوا کچھ نہیں کرتے اور ان کا طرزِ عمل مشینوں اور بندروں سے مماثل ہوتا ہے آدم اور فرشتوں کا یہ دل کش موضوع مجھے ہمیشہ اپنی اصلی سطح پر لے آتا ہے۔ جب میرا ہم نام سیستان کے ریگ زار پر زور آزمائی کر رہا تھا اُس وقت یہ گہرائی ٹخنے سے زیادہ نیچی نہیں تھی۔ لیکن اب یہ دل کی گہرائی میں تبدیل ہو گئی ہے اِس لیے اس خیال سے کہ میں محفوظ رہوں اسے آپ کے دلوں کی گہرائی میں جاگزین ہونے کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ اور رستم کی اس دعا پہ واپس آتا ہوں کہ اُس کا تھوڑا سا وزن کم کر دیا جائے۔ خُدا نے ایک آرڈی ننس جاری کر کے رستم کی تھوڑی سی طاقت واپس لے لی۔

آرڈی ننیس میں حسبِ معمول یہ دیباچہ موجود تھا کہ ہرگاہ رستم کی دو ٹانگوں میں بہت زیادہ طاقت جمع ہو جانے کی وجہ سے خود اسے تکلیف ہوتی ہے اور اس عاجز مخلوق کو بھی جو زمین پر چلتی ہے اِس لیے یہ قانون نافذ کیا جاتا ہے....... اس امر پر تاریخ کچھ مشکوک ہو جاتی ہے اور ٹھیک ٹھیک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ طاقت کس طرح واپس لی گئی لیکن نتائج کا جائزہ لینے کے بعد اس کہانی کے کچھ مؤرخ کہتے ہیں کہ رستم کو اپنے حال پر چھوڑ دینا بہتر ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ فطری طریقے سے یعنی خوراک کم کر کے یا ورزش کے ذریعہ اپنا وزن کم کر لیتا اور ایسے مصنوعی طریقوں کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ پڑتی جیسے یہ کہ وہ اپنی چوبی کھڑاؤں اُتار ڈالے۔ آرڈی ننیسوں کی حکومت جو ایک تصوّر کی حیثیت سے بظاہر صحت مند معلوم ہوتی ہے عملی طور پر ہمیشہ صحت مند نہیں ہوتی۔ نسلاً بعد نسلٍ خدا کے ایجنٹوں نے رستم کی طاقت اس طرح نچوڑی ہے کہ بستان اور مغربی پاکستان کے درمیان جو ایک دوسرے سے متصل علاقے ہیں وزن میں بہت زیادہ کمی واقع ہو گئی ہے اور آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ دو سو اسّی پونڈ سے کم ہو کر ایک سو بارہ پونڈ سے ذرا اُوپر رہ گیا ہے اور اس فرا اوپر وزن کے بارے میں بھی آپ کو کبھی یقین نہیں ہو سکتا اور پھر جب یہ کہانی مشرقی پاکستان پہنچتی ہے، جہاں تک صرف طیاروں کے ذریعے رسائی ممکن ہے، تو یہ محض ایک پیکرِ خیالی ہی رہ جاتی ہے۔

ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر وحید نے جب جُون کے وسط میں رسمِ افتتاح کا فیصلہ کیا تھا تو اُن کے ذہن میں اسمبلی کا خیال نہیں تھا۔ انھوں نے اپنا خطبہ اُردو میں لکھا تھا اور اُس کا اسلوب بڑا دلنشین تھا اور چونکہ میرے لیے اس کی ہمسری مشکل تھی اِس لیے مَیں نے کہا "مگر مشرقی پاکستان والوں کا کیا ہو گا" اور اس پر ڈاکٹر وحید کو خیال آیا کہ اگر مشرقی پاکستان والوں کو بھی باخبر کرنا مقصود ہے تو خطبہ انگریزی میں

ہونا چاہیئے پھر انھیں یاد آ گیا کہ انھی دنوں اسمبلی کا اجلاس بھی ہو رہا ہوگا۔ اور اس کے ارکان کو مدعو کرنے کا یہ نادر موقع ہے بالخصوص مشرقی پاکستان کے ارکان کو جو دوبارہ واپس نہیں آئیں گے کیونکہ موجودہ آئین کی یہی خواہش ہے۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ڈاکٹر وحید کے لیے یہ کتنا زریں موقع تھا۔ البتہ میرے لیے یہ یقیناً زندگی کا بہترین موقع تھا۔ کیونکہ گزشتہ سال مجھے چاٹ گام بار ایسوسی ایشن کی طرف سے دعوت موصول ہوئی تھی کہ میں اس کے یوم تاسیس میں شرکت کروں جو اسّی سال بعد منعقد ہو رہا ہے۔ کتنی طویل ہے یہ مدت، مگر میں اس موقع سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ یہاں سے چاٹگام کتنی دُور ہے۔ میں نے کہا کہ خدا نے کوئی سبب پیدا کر دیا تو آ جاؤں گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے اُس نے قومی اسمبلی کے ارکان کے لیے سبب پیدا کر دیا ہے۔ مگر خدا نے کوئی سبب پیدا نہیں کیا اس لیے میں نے خود ہی ایک موقع نکال لیا ہے لیکن طباعی کی کمی کے باعث یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ تقریباً آٹھ سال قبل میں نے ایبٹ آباد میں مکان بنانے کے لیے حکومت سے روپیہ قرض لینے کے لیے ایک درخواست دی تھی اس پر مجھے اطلاع دی گئی کہ مجھے اُس صورت میں قرض مل سکتا ہے کہ میں کراچی، لاہور، ڈھاکہ یا چاٹ گام میں مکان بناؤں۔ بعد میں ایک ضمیمے کے ذریعے اُن پانچ بڑوں میں راولپنڈی کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور ادارۂ اقوام متحدہ کے مقابلہ میں یہ آگے کی جانب ایک بہت بڑا قدم ہے جہاں اب بھی صرف چار بڑوں کو اپنے ویٹو کے گناہِ اولین کے ارتکاب کی اجازت ہے۔ اور اس ادارے کے آئین میں اتنی بھی لچک نہیں ہے کہ وہ کوئی ضمیمہ یا غلط نامہ جاری کر سکے۔ کیا آپ نے کبھی اندازہ لگایا ہے کہ ووٹ اور ویٹو میں صرف کیفیاتی فرق ہے (اور انگریزی میں) یہ دونوں الفاظ صرف حروف کے ہیر پھیر سے بن جاتے ہیں۔ آپ کو اپنا تن ڈھانپنے کے لیے چار قسمات کپڑوں کی ضرورت ہے اور قمیص کا دامن گھٹنے تک لمبا ہو اور پتلون کی اُونچائی کمر تک

ہو تو آپ ویٹو اور ووٹ کا فرق سمجھ لیں گے اور آپ کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ افریقہ اور ہونولولو میں بین الاقوامی کھچڑی پر اُبال کے دوران میں چار بڑے ایک دوسرے کی پتلون کس طرح پہنتے ہیں لیکن چاٹ گام سے اقوامِ متحدہ تک ایک دُور افتادہ صدا ہے اِس لیے بہتر ہے کہ میں سمندر پار کے ویٹو سے اپنے ملک کے ووٹ پر واپس آؤں۔ جہاں اُن ووٹوں سے قطع نظر، جن کا علم آپ کو مجھ سے زیادہ ہے، چھوٹے چھوٹے ویٹو بھی موجود ہیں جن میں یہ ویٹو بھی شامل ہے کہ آپ ایبٹ آباد میں مکان بنانے کے لیے قرض حاصل نہیں کر سکتے۔ اِس پر میرے اُن دوستوں نے جو جانتے ہیں کہ ایسے ویٹو اور قاعدوں کی خلاف ورزی کر کے کس طرح اُن کا احترام کیا جاتا ہے مجھے مشورہ دیا کہ میں قرض کے لیے درخواست دے دوں اور یہ لکھوں کہ میں چاٹگام میں مکان بنانا چاہتا ہوں۔ یہ جگہ ممتاز افراد کے دَوروں کے راستے سے کچھ ہٹ کر ہے۔ اس لیے کسی کو معلوم تک نہیں ہوگا کہ مکان نہیں بنایا گیا۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ میں کس طرح ایبٹ آباد میں مکان بنا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مکان چاٹگام میں بنایا گیا ہے۔ اس پر مجھے مشورہ دیا گیا کہ اگر میں چاٹ گام جانے اور قطعہ زمین کے لیے بات چیت کرنے کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں تو پورا معاملہ طوفان پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ جو عمارتوں کو اُن کی بنیاد سے اکھاڑ کر ایبٹ آباد ایسی جگہ پہنچا سکتا ہے۔ طوفان بالعموم تباہی پر منتج ہوتا ہے اور کبھی کبھار اگر یہ تعمیری روش اختیار کر لے اور ایک مکان کو مشرق سے اُڑا کر مغرب پر پہنچا دے تو اس سے کسی کو صدمہ کیسے پہنچ سکتا ہے۔

لیکن میں چاٹگام نہیں گیا اور اگر نئے آئین میں یہ بات موجود نہ ہوتی کہ پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس راولپنڈی میں ہوگا۔ تو آج کی افتتاحی تقریب بے جان ثابت ہوتی اگر آپ آئین میں ترمیم کا وعدہ کریں کہ مشرقی پاکستان کے ارکان ایک مرتبہ ہمارے ہاں

آئیں گے، خواہ وسط جُون ہی میں کیوں نہ ہو، تو ہمارے زمین میں شیکسپیئر کے ڈرامے
مڈسمر نائٹ ڈریم
کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ اور بجھے ڈاکٹر وحید سے وعدہ لینا پڑے گا کہ وہ ہر سال ایک
پبلشنگ ہاؤس کھولا کریں گے اور اس کام کی ابتدا اسلام آباد سے ہو گی۔ اس ضمن میں
اُنھوں نے ایک خاکہ پہلے ہی تیار کر رکھا ہے جس کے ذریعے براستہ کوہ مری اس
کام کو ایبٹ آباد تک پہنچایا جائے گا۔ میں بھی اُن اشاعتی اداروں کی افتتاحی تقریبات
میں شرکت کا وعدہ کروں گا۔ اور نذر الاسلام کی زبان میں اپنی تقریر کروں گا۔ میں اس سلسلہ
میں اقوام متحدہ کا بھی جائزہ لُوں گا۔ بشرطیکہ یہ مقدس ادارہ اُس وقت تک قائم رہا۔ میں
نے ۱۹۷۰ء میں بنگالی سیکھنے کا ارادہ کیا ہے اور ۱۹۷۱ء میں مَیں بنگالی میں تقریر کروں گا۔
اور اس بات کی وضاحت کر دوں گا کہ خود اختیاریت، ہائیڈروجن بم کی نسبت زیادہ مؤثر
ہے اور یہ کس طرح ناانصافی کو اور مستحرانہ استبداد کے حقوق کو بلندیوں پر لے جاتی ہے
اگر آپ کو یہ بات غیر سنجیدہ معلوم ہوتی ہے تو مجھے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ
۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور جو اُس وقت غیر سنجیدہ نظر آتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ایک زندہ حقیقت
بن گئی تھی۔ اِس مرتبہ یہ چٹا گانگ ہونا چاہیئے کیونکہ ڈھاکہ بعض اوقات مرطوب ہوتا
ہے۔ اس کے علاوہ چٹا گانگ کے ساتھ ایک رومانی احساس بھی پایا جاتا ہے ایک
گھر ملیو گانگ رگھریال، جو آپ کو متحدہ عمل کے لیے بُلا رہا ہے۔
اَے مشرقی پاکستان کے صاحبو! آپ کے عقائد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں آپ
نے لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ اصولی ذاتی مفاد کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ڈاکٹر عبدالوحید کو ایک دفعہ کہتے سُنا تھا کہ اب
مغربی پاکستان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُسے پاکستان میں رہنا چاہیئے یا جنت کی طرف
کُوچ کر جانا چاہیئے۔

پارلیمنٹ کی بحالی کے سلسلے میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس سے ہماری حسِ مزاح
بھی بحال ہو گئی ہے یہ ایک اہم خاصیت ہے جو آپ کو مشکلات میں گھرا ہوا ہونے
کے باوجود "جوابی حملہ" کرنے کے قابل بناتی ہے۔ یہ اب نوک جھونک کی صورت میں
ظاہر ہوتی ہے جسے اخبارات کی زبان میں "اسمبلی کی جھلکیاں" کہا جاتا ہے۔ ان کو پڑھ کر
مجھے ایک پرانا قصہ یاد آجاتا ہے جو میرے ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ سابق پنجاب
کے ایک چھوٹے سے مقام پر جہاں افسروں کی بیویاں ایک دوسرے سے ملاقاتیں
کیا کرتی تھیں، میرے ساتھ میرا ایک، چچازاد بھائی ٹھہرا ہوا تھا۔ افسروں کی اُن بیویوں
میں اکثریت یورپی خواتین کی تھی۔ میرے چچازاد بھائی نے ایک ایسی لڑکی سے شادی
کرلی جو امرت سر کے الیگزینڈرا اسکول کی تعلیم یافتہ تھی۔ حالانکہ اُس میں اُس سکول سے
فارغ التحصیل ہونے والی لڑکیوں کی سی کوئی بات نہ تھی۔ چونکہ میری بیوی دوسرے
لوگوں کے ہاں ملاقات کے لیے جانے کی عادی نہیں تھیں اس لیے وہ دُوسرے
افسروں کی بیویوں کی ملاقات کے بعد جوابی ملاقات کے لیے الیگزینڈرا اسکول میں
پڑھی ہوئی اس لڑکی کو بھیج دیتی تھیں۔ اور اس کے ہمراہ ہمارا بیٹا رضا بھی بھیج دیا جاتا
تھا، رضا کی عمر اُس وقت تقریباً پانچ برس تھی۔ یہ طریق خاصا کامیاب نظر آتا تھا۔ تاآنکہ ایک
روز میں نے رضا سے دریافت کیا کہ کیا اس کی چچی یعنی الیگزینڈرا اسکول کی فارغ التحصیل
خاتون انگریز خواتین کے ساتھ انگریزی میں باتیں کرتی ہیں۔ اس نے کہا جزوی طور
پر۔ انگریز خواتین بولتی چلی جاتی ہیں اور چچی "یس" کہتی ہیں یا کبھی "نو" ــــ انسانوں
میں یہ مختلف جبلتیں اجتماعی شعور کی سطح پر مختلف ادوار میں متفرق نظر آتی ہیں۔ قبل
ازیں میں نے فرشتوں اور بدروحوں کے دلکش موضوع پر تقریر کی تھی۔ حال ہی میں میں نے
ایک کتاب "پیس اینڈ رونیسین" کے بعض اقتباسات آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی
طرف سے شائع ہونے والے ایک جریدہ میں پڑھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی اس جریدہ

کو اپنی کتابوں کی تشہیر کے لیے شائع کرتی ہے یہ اقتباسات پڑھ کر میں حیران رہ گیا
ان اقتباسات میں بتایا گیا تھا کہ شروع میں ہماری جبلتوں کا ذریعۂ اظہار دیوتا کی مذہبی تقسیم
نزشتوں اور بدروحوں کی طاقتوں، تاریکی اور روشنی، خدا پر یقین رکھنے والے اور
کافروں میں امتیاز تھا۔ اب ان جبلتوں کا ذریعۂ اظہار سیاسی تقسیم کے مطابق نظریاتی
طور پر مقبول اور راندہ افراد کے درمیان آویزش ہے اب شیطان کے خوف کی
جگہ کمیونسٹ (اگر آپ سرمایہ دار ہیں) آباد کار (اگر آپ کسی کالونی سے تعلق رکھتے
ہیں) اور ری پبلکن (اگر آپ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے) نے لے لی ہے ہر
ایک گروپ کی رائے دوسرے گروپ سے اتنی زیادہ مختلف ہو سکتی ہے کہ گروپ
کے ارکان اس بات کے قائل ہو جائیں کہ دوسرے گروپوں کے خلاف ہر وہ کارروائی
جائز ہے جس سے اس گروپ کو مجموعی اعتبار سے فائدہ پہنچتا ہو۔ اس طرح گروپوں
کی آرا بطور خاص ہو جائیں گی اور دوسرے گروپوں میں آراء اتنی زیادہ مختلف ہو جائیں گی
کہ انھیں نظرانداز کر دیا جائے گا لیکن ایک جدید طرز کے ملک میں آپ دوسرے
ملکوں کی رائے کس طرح نظرانداز کر سکتے ہیں یا اس ملک میں دوسرے گروپوں کی
رائے کیونکر بے وقعت قرار دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی دُنیا میں دو بڑی ضرورتیں ہیں پہلی ضرورت، جسے مصنف دوسرے
درجہ پر رکھتا ہے، یہ ہے کہ ہر مختلف گروپ کی رائے خواہ وہ نظریاتی ہو یا جغرافیائی
اسے دوسرے گروپوں کی رائے کا ممکنہ حد تک قریبی علم ہونا چاہیئے اُس سے پورے
معاشرے کی ایک مجموعی رائے جنم لے گی جس کے ذریعے بین الاقوامی حالات کا
جائزہ لے سکے گا۔ اگر روس ہنگری میں، برطانیہ اور فرانس سویز میں اور امریکہ کیوبا میں
اپنی کارروائیوں کے عالمی ردعمل کو پہلے سے دیکھ سکتے تو اُن پر کبھی جارحیت نہ کرتے
دوسری ضرورت ملک یا گروپ کی رائے کو اُن خطرات سے آگاہ کرنے کی ہے جن

میں عوام کی اجتماعی تمنائیں انھیں مبتلا کر سکتی ہیں۔ اور اس سلسلہ میں رائے عامہ بنانے والے سیاسی راہنما، اداریہ نویس، تبصرہ نگار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کے جذبات اور غیر منطقی رجحانات سے پوری پوری آگہی رکھتے ہیں۔ اور رائے عامہ کی زیادہ متوازن اور بامقصد رجحانات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اور اس طرح اسے شدید تر نوعیت کے ردِ عمل کا شکار ہونے سے محفوظ رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک ایسی دُنیا میں جہاں متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی رائے عامہ انجام کار ایک سدِ باب کی حیثیت رکھتی ہے لیکن رائے عامہ کے مؤثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اس کا فیصلہ عام اخلاقی ضابطے سے مطابقت رکھتا ہو۔ بنی نوع انسان کے لیے عمرانیات میں کوئی شعبہ بھی دوسرے گروہوں اور دوسری قوموں کی نفسیات اور معاشرتی عادات کے مطالعہ سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! قصہ مختصر آپ کا سیاسی مسلک خواہ کچھ بھی ہو اور اس امر سے قطع نظر کہ رائے عامہ پانی کی طرح اپنی سطح ہموار رکھتی ہے اس کی رہنمائی اور اور تشکیل آپ کے اپنے نظریات اور دوسرے ممالک کی رائے عامہ سے ہوتی ہے اس بات کو اچھی طرح یاد رکھیئے کہ ایک مضبوط رائے عامہ ہی ہے جو انجام کار آپ کے لیے ایک باوقار حیثیت اور غیر ممالک میں ایک دوستانہ رجحان پیدا کر سکتی ہے۔ اور یہاں ڈاکٹر عبدالوحید اپنے پبلشنگ ہاؤس کے ساتھ در آتے ہیں۔ انھوں نے بیس پیروں کے اپنے سپاسنامے میں سے سات پیرے اظہارِ خیال کی آزادی کی تاریخ کے لیے وقف کیے ہیں جو ان کے موجب، بالآخر مجھ پر منتج ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا ہے "اظہارِ خیال اور تقریر کی آزادی کے حقوق ایسی بنیادی و لازمی چیزیں ہیں جن کے بغیر صنعت اشاعت کا نو دمغ پاتا تو کجا، وہ اپنا وجود بھی برقرار

نہیں رکھ سکتی۔ میرے خیال میں مجھے اسے "اشاعت کی سائنس" کا نام دینا چاہیئے کیونکہ اگر اس کی طرف ایک سائنس دان کے تجرباتی جذبہ کے ساتھ رجوع نہ کیا جائے تو یہ فن کی تمام قدروں سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر وحید نے کہا ہے کہ اُن کے پرنٹنگ اور پبلشنگ ہاؤس کی راولپنڈی شاخ کا افتتاح کرنے پر میرا رضامند ہونا اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انھوں نے پبلشرز کی حیثیت سے قومی شعور کو اجاگر کرنے میں اور رائے عامہ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ماضی میں اس سپاسنامہ کی ایک نقل موصول ہونے پر میں نے متذکرہ حقیقت کا اعتراف کیا تھا یا نہیں لیکن میں بعض شرائط پر مستقبل میں اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار ہوں تاہم مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ انھوں نے مجھے جو پہلا دعوتی خط لکھا تھا اُس سے مجھ میں اشاعت و طباعت کے بارے میں قومی شعور ضرور پیدا ہوا۔ حالانکہ یہ واقعہ آٹھ جون سے یعنی قومی شعور کے مقررہ دن سے پہلے کا ہے۔ میں واضح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ حب الوطنی کے کسی جذبہ نے مجھ پر اضطرابی کیفیت طاری کی کیونکہ شیطان کو بھی آدمی کے دل کی بات کا علم نہیں اور صرف اپنے ہی دل کی بات کا علم ہوتا ہے۔ میں ڈاکٹر وحید کو پہلے سے جانتا ہوں میں نے اُن کا ڈرائینگ رُوم بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ مجھے ڈائیننگ روم اور ڈرائینگ رُوم کے درمیان گھومنے والے دروازے کو گھومتے ہوئے دیکھے عرصہ ہو چکا ہے۔ لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ گھومنے کا سلسلہ ابھی تک بڑے اچھے طریقے پر جاری ہے۔ آدمی کو ایسے دروازے اکثر دیکھنے چاہئیں لیکن میں اُن کے بارے میں قومی شعور کے حامل فرد کی بجائے وزیر اعلیٰ کے طور پر سوچا کرتا تھا اور بعض اوقات میں یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ طباعت و اشاعت جیسی مقابلۃً حقیر تجارت سے کیوں چمٹے ہوئے ہیں لیکن جب میں نے گھومنے والا دروازہ دیکھا تو میں نے خیال کیا کہ اس تجارت میں کچھ اور معنویت پوشیدہ ہے اور ایک روز جب

میں لاہور میں داخل ہُوا اور کتابوں کی دنیا کی مسرتوں سے بہرہ ور ہوئے لگا تو میرے خیالات میں تبدیلی آگئی۔ اور مَیں نے کہا کہ اس میں اور بھی معنویت پوشیدہ ہے۔ اگر مَیں تکبّر اور تفاخر کے جذبہ کے بغیر اپنے ذہن کا تجزیہ کروں تو یہ تھی میرے تحت الشعور کی کیفیت۔

.... جب مجھے اُن کا خط موصول ہُوا خط کے مندرجات کا انکشاف کیے بغیر مَیں اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس سے مجھے ایک خوش گوار سے عینی کا احساس ہُوا۔ یہ احساس کہ آسمان اور زمین پر ہر گوشہ میں ایسے اُن لوگوں کی تعداد ہمارے علم سے کہیں زیادہ ہے جو درد کا شکار ہوتے ہیں لیکن وہ ایک بظاہر ورے میرا زندگی پُرسکون وقار کے ساتھ برداشت کرتے ہیں اور انھیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکیں۔ جب مجھے اذہان میں اس قسم کی نفسیاتی جھلک دکھائی دیتی ہے تو مَیں اپنے آپ کو ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) کی نظم سائمن کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کی آنکھوں میں اس وقت تشکر کے آنسو بھر آئے تھے جب اس پر کوئی چھوٹا موٹا احسان کیا جاتا تھا مثلاً کلہاڑے کی ایک آدھ ضرب سے اُس کے لیے کسی چھوٹے سے درخت کو کاٹ دینا۔ میرے لیے یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ قومی شعور ایک ایسے شعبۂ زندگی میں رواں دواں ہوگیا ہے جس کے بارے میں اس امر کا وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

اب مَیں اس کی تعریف کروں گا کہ ایک پبلشر قومی بیداری کی اشاعت کے سلسلے میں کس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ فی الحال قومی اسمبلی میں یا قومی اسمبلی سے باہر کی جانے والی تقریروں کو ہی لیجئے ان میں بعض نے آپ میں قومیت، قوم داری اور اس وسیع خلیج کا شعور پیدا کیا ہے، جس کو تیر کر پار کرنے سے ہی ہمیں دوسرے کنارے پر عالمی رائے عامہ مل سکتی ہے۔ اگر یہ تقریریں صرف متعلقہ سامعین تک ہی محدود رہتیں اور شائع نہ

کی جاتیں تو ملک کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا اور ذہنی غذا جو مضبوط رائے عامہ بنانے کے لیے ضروری ہے قوم کو نہ ملتی۔ تعجب ہوتا تھا کہ پبلشر کو کیوں ایک ایسی چیز پر جسے مصنف لکھتا ہے اور پرنٹر چھاپتا ہے، چھپنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن میں نے ایک جگہ ایک مضمون پڑھا تھا کہ اشاعت گوناگوں ادبی کاموں کی تجارت ہے۔ اور جدید زمانے کے پبلشر کا کام مصنفین کے فائدے کے لیے ادبی شاہکاروں سے تجارتی استفادہ حاصل کرنا ہے۔ ادبی استعداد بہت بڑا سرمایہ ہے اور جب اسے خوشامد سے ملوث نہ کیا جائے تو قومیت کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔

گزشتہ چار برس میں جو اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں میں نے اُن کے دسویں یا پندرھویں صفحہ سے آگے نہیں پڑھا۔ کیونکہ اُن میں بعض بڑے آدمیوں کے لیے خوشامدانہ حوالے استعمال کیے گئے ہیں۔ پرانی کتابوں میں کم از کم ایک خُوبی ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ ان میں مختلف ابواب باندھے جاتے تھے۔ پہلا حمد کا دوسرا نعت رسول مقبول صلعم کا، تیسرا بادشاہ کی مدح میں۔ چوتھا اپنے محسن کی تعریف میں۔ اور اگر آپ کو تقسیم ابواب کے اس طریقے سے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ خدا تعالیٰ کی ذات عظیم ہے اور رسول پاک صلعم، اللہ تعالیٰ کی اس عظمت و جلالت کے روحانی مظہر ہیں اور بادشاہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہے تو ان ابواب سے آپ جلدی جلدی گزر کر علین کہانی تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے جدید دَور میں آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آسمانی روشنی ـــــ جو نہ سمندروں میں موجود ہے اور نہ زمین پر کب آپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ناشرین کو ایسی کتابیں قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انھیں وسیع تعلیمی پس منظر اور اعلیٰ ثقافتی جواہر کا حامل ہونا چاہیئے تاکہ وہ عوام کی صلاحیتوں کو تباہ ہونے سے بچا سکیں۔ ڈاکٹر وحید نے مجھے ایک انفرمیشن بلیٹن دیا تھا۔ جس میں مَیں نے یہ فقرے پڑھے کہ پاکستان میں کئی مستند مصنف موجُود

ہیں مگر چند ایک جو خلوص سے علم میں اضافہ کے لیے مساعی کر رہے ہیں اُن کی بلیشر پبلشرز
کے رویہ سے حوصلہ شکنی ہو رہی ہے۔ بعض مصنفین اپنے خرچ پر اپنے مسودات شائع
کرنے لگے ہیں اور بعض مصنفوں کو اپنے وقت اور محنت کے ضیاع کے باوجود عملی طور
پر کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب مَیں نے یہ پڑھا تو مَیں نے یہ خیال کیا کہ میرے دل میں جو
خدشات تھے وہ صحیح تھے کیونکہ گزشتہ دو تین سال کے دوران، ایک کے سوا کئی
مصنفوں نے مجھے بتایا ہے کہ اگر پبلشر کتاب کے دو ہزار نسخے چھپوائے تو وہ ہمیشہ
آپ سے یہی کہے گا کہ ابھی یہ فروخت نہیں ہوئے بلکہ جو نسخے فروخت ہوئے ہیں وہ
مصنف کو بتائے بغیر شائع کیے گئے ہیں۔ ایک مصنف جو اس سے مستثنیٰ تھا وُہ تھا
جس کی کتابیں فیروز سنز نے شائع کی تھیں۔ اور مجھے اسے صحیح کرنے کی اجازت دیجئے
کہ یہ ہمہ گیر اطلاق کی بات ہے اور تمام بڑے اوارے قدرتی طور پر ان کی شہرت سے حسد
کریں گے۔ ان کے ذہن میں وہ پبلشر نہیں تھا جس نے ایک رات دس بجے کے بعد
مجھے ٹیلیفون کیا اور بڑے اطمینان سے مجھے یہ اطلاع دی کہ اُس نے میری ایک طویل
تقریر شائع کی ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی اور تقریر ہے۔
مجھے کہنا پڑے گا کہ رات کے دس بجے ایک ایسے پبلشر کا علم ہونے سے فخر کا احساس
ہُوا ہو۔ ایک وسیع تعلیمی پس منظر اور اعلیٰ ثقافتی اہلیت کا حامل ہے اور جس نے بذاتِ خود
دس بجے سے پہلے ایک باصلاحیت شخصیت کا پتہ چلا آیا تھا۔ اور اگر ٹیلیفون ہمیں
جُدا نہ کر دیتا تو مَیں اُس شخص سے بغل گیر ہو جاتا جس کی قوم پرستی اور حب الوطنی نے
اُس پر رات کے دس بجے بے چینی طاری کر دی تھی لیکن شیطان نے میرے کان
میں سرگوشی کر کے مجھے شک میں ڈال دیا اور یہ شُبہ کرتے ہُوئے کہ وہ قوم کی بلامعاوضہ
خدمت نہیں کر رہا۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ آیا وہ اس تقریر کو جو اُس نے طبع کی ہے
فروخت کر رہا ہے۔ اُس نے کہا "جی ہاں! مَیں اُسے فروخت کر رہا ہُوں۔ اور مَیں نے

اُس کی قیمت ایک آنہ فی جلد رکھی ہے ۔ میں نے چلا کر کہا: "ہمت تیرے عظیم مکینن کی تو مجھے ایک آنہ میں فروخت کر رہا ہے۔" وہ چند لمحوں تک خاموش رہا گویا کہ اُس کو سخت حیرت ہوئی ہو اور پھر اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا "کیا میں اس کی قیمت چار آنے کر دوں ؟"

اُس نے مجھے تین جلدیں رائلٹی کے طور پر بھجوا دیں۔ میں یہ قصہ یہاں اس لیے دہرا رہا ہوں کہ ڈاکٹر وحید کے ذہن سے وہ بات خارج کر دوں جو انھوں نے اپنے ایڈریس کے دوران کہی تھی "ہو سکتا ہے کہ کتب و رسائل کی تیاری میرے لیے مادی منفعت کا باعث نہ ہو" میں بلاشبہ امکانی طریق پر پیسہ کمانے کا خواہش مند ہوں اور اس امر کا یقین کرنے کے لیے میرے ایجنٹوں نے آزمائشی طور پر میری کتاب کی طباعت کا کام پہلے ہی فیروز سنز کے سپرد کر دیا ہے۔ جب طباعت ہو جائے گی تو وہ ایک اور آزمائش کے طور پر اس کی فروخت کا کام بھی فیروز سنز کے سپرد کر دیں گے تا کہ آزادی تقریر اور آزادی اشاعت کے درمیان مزید یگانگت پیدا ہو جائے۔

مجھے اس خوش آیند خیال پر ہی اپنی تقریر ختم کر دینی چاہیے تھی لیکن ایڈریس میں ایک چھوٹا سا پیرا ایسا ہے جو کچھ ایسا زیادہ خوش کن نہیں ہے یہ چودھواں پیرا ہے جس میں اُنھوں نے کہا ہے کہ طباعت و اشاعت کی صنعت کو "بحران در بحران" کا سامنا کرنا پڑا ہے جس کا باعث حکومت کا سوتیلی ماں کا سا سلوک ہے۔ اس بات کا خصوصی اشارہ حکومت کے اس فیصلہ کی طرف ہے جس کا مقصد ابتدائی درجہ سے اعلیٰ ثانوی سکول کے درجے تک کتابوں کی ترتیب و تدوین، طباعت و اشاعت اور اس طرح نصابی کتابوں کے شعبوں میں اجارہ داری قائم کرنا ہے۔ وقتاً فوقتاً نصابی کُتب سے متعلق سکینڈل سننے میں آتے ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سکینڈلز کے ذمہ دار ناشرین ہیں یا سرکاری ایجنٹ۔ تاہم سرکاری اجارہ داریوں کے سلسلے میں

عمومی طور پر خوش آئند توقعات وابستہ کرنا ممکن نہیں۔ ایسا کوئی کام نہیں جس کی انجام دہی کے سلسلے میں سرکاری ایجنٹوں نے نجی صنعت کاروں جیسی حزم و احتیاط سے کام لیا ہو۔ یہ لوگ سونے کو تانبا بنا دیتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری ایجنٹوں کو باقاعدگی سے ماہ بماہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور محض احساسِ فرض اُن کے غیر حسّاس دلوں کے زیب نہیں پہنچتا۔ عدالتِ عالیہ کو سرکاری طباعت کا قدرے تجربہ ہے اور اس کی برکت سے ان غلطیوں کے علاوہ جن کی ہماری کتابوں میں بھرمار ہوتی ہے۔ سرکاری قانونی رپورٹیں اُس وقت زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی ہیں جبکہ اُسی موضوع پر نجی رپورٹوں کو طبع ہوئے چھ ماہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ حکومت اجارہ داری کے شعبے میں اپنے ایجنٹوں کے کارہائے نمایاں سے ناواقف ہو گی جو اس نے ایک نیا جامہ زیبِ تن کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اشاعت کی سائنس سے متفق الرائے ہے اور اپنے پُرانے کپڑوں کو ڈرائی کلین کرنا چاہتی ہے۔ تو ڈاکٹر وحید اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اُن کی خدمات قبول کی جائیں یا نہ کی جائیں مجھے اس امر کا یقین ہے کہ وہ اشاعت اور کتاب فروشی کے پیشے کو ترک نہیں کریں گے۔ اُن کے والد اور دادا بھی یہی پیشہ اختیار کیے رہے۔ میرے والد نے مجھے دمہ کے ایک شدید حملے کے بہت جلد بعد باغ میں کام کرتے دیکھا۔ اور جب میرے چچا نے یہ کہہ کر اُن کی توجہ اِس امر کی جانب مبذول کرائی کہ مجھے عقل سے کام لے کر ایک ہفتہ تک آرام کرنا چاہیئے تو میرے والد نے مایوسی کے عالم میں کہا کہ "وہ مجبور ہے اس کا دادا بھی باغبان تھا"

خواتین و حضرات! اب میں رسمِ افتتاح کی ادائیگی کے لیے تیار ہوں۔

(جسٹس کیانی مرحوم فیروز سنز کی راولپنڈی شاخ کے افتتاح کے لیے علالتِ طبع کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ یہ خطبہ اُن کی جانب سے راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کے سینئر رکن قاضی نذیر احمد نے پڑھ کر سنایا۔)